(62)

جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لنگویجز۔ سرینگر
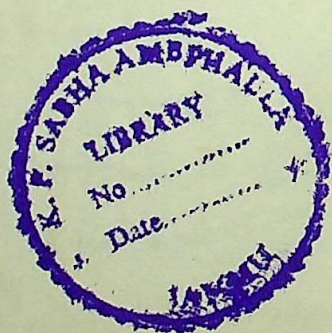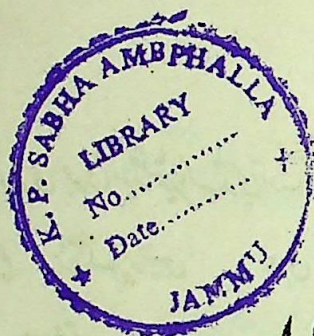
ہمارا ادب

۱۹۷۳ء

ترتیب

محمد یوسف ٹینگ
محمد احمد اندرابی

جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز سری نگر

طابع:۔ سیکریٹری جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز سری نگر

مطبع:۔ ایم۔ایم پرنٹنگ پریس، دہلی ۶

کتابت:۔ محمد صدیق

پہلی بات

"ہمارا ادب" کا ایک اور شمارہ حاضر ہے۔

اردو ایک ایسی شاخِ زیتون ہے جو سرزمینِ کشمیر کے بطن سے تو نہیں ابھری۔ لیکن جب بادِ بہاری کے کسی جھونکے کے فیض سے یہاں اسکی کونپل پھوٹ پڑی۔ تو دیکھتے ہی دیکھتے اسکی جڑیں اس شاداب سرزمین کے سینے میں دُور دُور تک پیوست ہوگئیں اور اس کے برگ و بار میں چنار جیسی جلال آمیز بالیدگی نظر آنے لگی۔ ہمارے موجودہ شمارے میں اسی بات کی عکاسی کی کوشش کی گئی ہے۔ چنانچہ اردو نے ریاست کے مختلف خطوں کے درمیان، جنکی مادری زبانیں مختلف ہیں، رابطے کی زبان کی حیثیت سے کس قدر اہم مقام حاصل کر لیا ہے۔ اس کا اندازہ اس شمارے میں شامل قلم کاروں کی فہرست پر نظر ڈال کر کیا جاسکتا ہے۔ اِن لکھنے والوں میں بارہ مولہ سے کٹھوعہ اور کشتواڑ سے پونچھ تک کے ادیب و شاعر ایک ساتھ کھڑے نظر آتے ہیں۔ اس طرح سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ریاست میں آبادی کے کسی قابلِ لحاظ حصے کی مادری زبان نہ ہونے کے باوجود اردو کا ایک ایسا رول رہ جاتا ہے۔ جس کا مقصد فصل کی بجائے وصل کے حالات پیدا کرنا ہے۔

محمد یوسف ٹینگ

ترتیب

مضامین

منظومات

غزلیں

افسانے

مضامین

شکیل الرحمان

اردو نظم کا المیہ

(نئی شاعری کے پس منظر پر چند باتیں)

اردو شاعری کی تاریخ میں "اردو نظم" کی تکنیکی اور فنی خوبیوں کی تلاش اور تجربوں کی تہوں میں داخل کرب کی پہچان آج نئی تحقیق کے لئے ایک بڑا چیلنج ہے پرانی تحقیق نے یہ کام نہیں کیا۔ پرانی تحقیق نے ایک بڑے سوالیہ نشان کو پایا ہی نہیں۔ تکنیکی اور فنی خوبیوں اور تخلیقی کرب اور جمالیاتی اقدار کے پیش نظر اردو شاعری میں مکمل، بہت اچھی، دل اور دماغ کو چھو لینے والی، احساس اور جذبے اور پورے وجود میں اتر جانے والی بہت ہی کم نظمیں ملیں گی، ایسی نظموں کی تعداد اتنی کم ہے کہ ہم انہیں انگلیوں پر گن سکتے ہیں۔

"غزل کی روایت" اور "مقصدیت" ——— اردو نظم کی یہ بنیادی کمزوریاں ہیں۔ غزل کے پختہ اسلوب سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ لیکن اسے نظم کا اسلوب بنایا نہیں جا سکتا۔ اقبال اور فیض نے اس سے فائدہ اٹھایا ہے، ان کے رچے ہوئے شعور نے عہد اور تاریخ کے مزاج کو سمجھتے ہوئے غزل کے اسلوب سے روشنی حاصل کی ہے۔ بہت کم لوگوں نے سمجھا ہے کہ نظم صرف لفظوں کے آہنگ، قافیوں اور ردیفوں کی جھنکار، تشبیہوں اور استعاروں اور چونکا دینے والی اصطلاحوں اور جمالیاتی ہیئت پر مقصدیت کو غالب کرنے اور دبا دینے کا نام نہیں ہے۔ اردو

کی زیادہ نظمیں وقتی، مصلحت انگیز، معمولی، حد درجہ مقصدی، ہلکی اور نظم کے آرٹ کو منھ چڑھانے والی ہیں۔ چند نظموں کی تاریخی اہمیت کے احساس سے بھی اردو نظم کی عظمت کا احساس نہیں ہوتا۔ غزل کی روایتی قدروں اور مقصدیت نے اردو نظم کے سانچے کو کمزور اور شکستہ کر دیا ہے۔ شاعروں کے "نمائشی تجربوں" نے اس آرٹ کو ابھرنے سے روکا ہے۔ نظم کے اپنے اسلوب کی تشکیل، مغربی نظموں کی جمالیات اور اس آرٹ کی تکنیکی اور فنی خوبیوں کی طرف توجہ بہت کم ہے۔

اردو نظم میں بہت سے خارجی اور داخلی جذبے اور تجربے ملتے ہیں لیکن غزل کی روایت سے نکلنے کی کوشش اور "مقصدیت" کو اپنے جذبوں میں گھلا دینے کی خواہش نہیں ملتی۔

ابتدا میں غزل اور نظم میں بنیادی فرق یہی سمجھا گیا کہ غزل میں محبوب سے باتیں ہوتی ہیں، عام روایتی استعاروں اور پیکروں کا استعمال ہوتا ہے اور نظم میں قومی، ملی یا نیچر اور انسان کے رشتے کے پیش نظر یا صرف نیچر یا سماجی ماحول کی کسی سطح پر کوئی مقصد ہوتا ہے ــ جب یہ احساس گہرا ہو گیا تو وہ شعور بھی جاتا رہا جو غزل کے اسلوب نے عطا کیا تھا ــــ "مقصدیت" اس طرح غالب آ گئی کہ نظم کا اسلوب کمزور اور ٹوٹا ٹوٹا سا نظر آنے لگا۔ نظم نگار شعراء نے "مقصد" ہی کو سب کچھ سمجھا اور باضابطہ تقریریں کیں، آواز کے آہنگ سے مرعوب کرنا چاہا، وقت کی مصلحت کو سب کچھ سمجھا۔ قاری کو مرعوب کیا، ڈرایا، رلایا، نہایت ہی معمولی سی بات کو کھینچ تان کر تماشہ بنا دیا۔ تجربہ کیجیے تو بہت ہی کم ایسی نظمیں حاصل ہوں گی، جنھیں ہم "سرمایہ" قرار دے سکتے ہیں۔

یہ شاعری آسان بھی تھی اس لئے کہ ایک طرف وہ عوام کی زبان سے قریب تھی اور دوسری طرف روایات سے مخصوص استعارے اور جانی پہچانی علامتیں استعمال کر رہی تھی۔ "مقصدیت" کا احساس ہی کرب بنا ہوا تھا۔ بہت سی ایسی نظمیں مل جائیں گی جن میں اچھی نثر کی خصوصیات بھی نہیں ہیں۔ ایسی نظموں کو آپ کہاں جگہ دیں گے۔ جن میں قافیوں، ردیفوں اور استعاروں اور محاوروں کے سہارے سیاسی، اخلاقی اور سماجی مقاصد کی پیش کش ہے اور واقعات کو منظوم کرنے کی شعوری کوشش؟

ہم "مقاصد" کو تاریخ کی مختلف لہروں میں پہچاننے کے باوجود بہت سی

نظموں کو "میراث" سمجھنا نہیں چاہئے۔ بہت سی نظموں سے ہم قطعی طور پر متاثر نہیں ہوتے، کچھ نظموں کا تاثر چند لمحوں کے لئے قائم ہو جاتا ہے اور پھر ختم ہو جاتا ہے — بہت ہی کم نظمیں ہمیں متاثر کرتی ہیں۔ نظیر، اقبال اور جوش کی کئی نظمیں آج بھی متاثر کرتی ہیں، دل اور دماغ کو کچھ کہتی گزر جاتی ہیں اور ہم لمحوں میں کچھ سوچنے لگتے ہیں۔ "مقصدیت" کے باوجود چند نظموں کی جمالیاتی قدروں اور ان کے داخلی آہنگ کے اثرات ہوتے ہیں۔ لیکن نظیر، اقبال اور جوش کی ان نظموں میں یہ جادو نہیں ہے جو مشہور ہوئیں۔ جن کا بہت چرچا ہوا۔ نقادوں نے اپنے مضامین میں جن کے حوالے دیئے اور جن کی بنیاد پر ان شعراء کو نظم کی تاریخ میں مستقل عنوان بنایا گیا۔ تجربوں کے بکھر جانے اور کینوس کے باہر پھیل جانے (نظیر) کا بھی احساس ہوتا ہے۔ تجربوں کو صرف عام لفظوں میں منظوم کر دینے اور صرف مقصد کو ابھارنے (اقبال) اور عہد کی مصلحت کے پیش نظر تاثرات کو تقریر کی صورت دے دینے، لفظوں کے آہنگ اور جھنکار سے متاثر کرنے کی کوشش (جوش) عمومی مزاج کے لئے ہے۔

عبدالحلیم شرر نے اردو نظم کو ایک نئے اسلوب دینے کی جو جدوجہد کی اسے یاد رکھا جائے گا۔ انگریزی نظموں کے ترجمے سے نظم معریٰ یا [illegible] کا ایک شعور دیا ہے۔ بے قافیہ نظمیں لکھی گئیں۔ شرر، آزاد، حالی، اسمٰعیل میرٹھی، وحید الدین سلیم، نظم طباطبائی، شوق قدوائی وغیرہ نے انگریزی نظموں کے ترجمے بھی کئے اور تکنیکی تجربوں سے بھی روشنی حاصل کی، نقالی بھی ہوئی اور اردو کے مزاج کو نئے مزاج سے ہم آہنگ کرکے اچھے تجربے بھی ہوئے۔ بنیادی طور پر یہ ترجموں اور نظم کے نئے اسالیب کی تشکیل کا دور تھا، ٹینی سن، ٹامس مور، لارڈ لٹن، گرے، والٹر اسکاٹ، لانگ فیلو، کاؤپر، کے ساتھ شکسپیر، گولڈ اسمتھ، اور کیٹس وغیرہ کی چند ہلکی پھلکی نظموں کے صاف اور سپاٹ ترجمے مل جاتے ہیں۔ بعض نظموں میں صرف بنیادی خیالات ان شعراء کے ہیں۔ انگریزی نظموں کے ترجمے کی تو اردو ادب میں ایک باضابطہ تحریک نظر آتی ہے۔ بچپن، جوانی، بڑھاپا، محبت، موسم گرما، موسم بہار، ترانۂ محبت، اندھی بھول والی، مٹی کا چاند "تاروں بھری رات"، چڑیا کے بچے"، افغانستان، حب وطن، بیوہ، گورِ غریباں، سوزِ بیوگی، تمام طور پر یہی موضوعات تھے۔ ظاہر ہے، پیچیدہ جذبات اور شدید داخلی کرب کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ کچھ نئی صورتوں کو وضع کرنے کی شعوری کوشش ہو رہی تھی، اس

ہمارا ادب

معاملے میں بزرگوں کو یقیناً کامیابی ہوئی، مقفّیٰ نظموں کا احساس ملا، عام فہم زبان کی اہمیت معلوم ہوئی۔ ہندی اوزان کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوا۔ محبوب (عورت) کا تصور بدلا، ہندوستان کی فضاؤں کی خوشبو ملی، مصرعوں کو خیالات کے پیش نظر توڑنے کا احساس پیدا ہوا، کچھ اہم تکنیکی تجربے ہوئے، بحروں میں تنوع پیدا کرنے کا خیال آیا، اور مرد اور عورت کے کئی جذبوں کی عکاسی ہوئی۔ یہ ابتدائی کوشش تھی اور کامیاب کوشش تھی۔ لیکن تاریخ کے ایک خاص دور میں ایسی تحریک سے تخلیق کے چشمے نہیں پھوٹتے، لہٰذا تخلیقی کیفیتوں کا فقدان رہا۔ وقت کے ساتھ ساتھ تجربوں میں کامیابی بھی ہوئی۔ لیکن "مقصدیت" "نقالی" اور روایات کی دیواروں کے سہارے کی وجہ سے اردو نظم کا ارتقاء رُک سا گیا۔ اس تشکیلی دور میں بھی "نقالی" اور "مقصدیت" کو کافی اہمیت حاصل تھی، اس کے بعد وہ روایتی اسلوب، اور وہ "روایت پرستی" بھی شروع ہو گئی جس سے "بغاوت کی گئی"!

قومی نظموں کی افادیت کبھی کی نگاہوں میں حقیقی بھی ہو حقیقت یہ ہے کہ ہم نے "قومی نظموں" کا صحیح تنقیدی تجزیہ ابھی تک نہیں کیا ہے، ہم نے صرف تاریخ کے مختلف خانوں میں ان نظموں کو پہچاننے کی کوشش کی ہے اور بس۔ اردو کے بعض نقادوں نے بھی "چکبست بہ حیثیت پیامبر جدید" "نظیر اکبرآبادی اور عوام" "جنگ عظیم کے بعد اردو شاعری" "حالی کی شاعری میں حب الوطنی کا جذبہ" "ہندوستان کی آزادی اور اردو شعراء" "اردو شاعری میں قومی وحدت کا تصور" اور "اردو نظمیں" "نظم میں مناظر قدرت کی عکاسی" جیسے جانے کتنے مقالے لکھے اور بہت سے غبارے پھونک پھونک کر پھیلائے، ظاہر ہے ایسے مقالے تخلیقی تجزیہ نہیں کر سکتے۔ آج بھی حالی، اکبر، اقبال، چکبست، جوش، شوق، سلیم، ناظر، اختر شیرانی، عظمت اللہ خاں، حفیظ جالندھری، احسان دانش وغیرہ کی نظمیں مکمل تجزیہ چاہتی ہیں۔ "اسمٰعیل، چکبست، نظیر اور سرور جہاں آبادی نئی ہندوستانیت کی مصوری کرتے ہیں" ——— تو ان کی نظموں میں یہ نئی ہندوستانیت احساس اور جذبے سے کس حد تک ہم آہنگ ہے، کیا ان کے تجربے جمالیاتی تجربے بن سکے ہیں؟ نظموں کے پیکر مقصدیت سے مجروح تو نہیں ہوئے ہیں؟ ...مقصد کے دباؤ سے تجربہ کیفیت اس سے باہر تو نہیں پھسل گیا ہے؟ داخلی آہنگ کیا ہے؟

یہ نظمیں کس سطح کی ہیں؟ نظم کے اسلوب میں کوئی کمزوری نامحسوس طور پر پیدا تو نہیں ہوگئی ہے؟ اور یہ کمزوری نظم نگاری کی اس بنتی ہوئی روایت میں سرایت تو نہیں کر گئی؟ مسدس حالی اور خضر راہ کی ادبی اہمیت کیا ہو سکتی ہے؟ وطنی شاعری صرف وقت کی بات تو نہیں تھی؟ سیاست سے شاعری کی دلچسپی اور سیاسی فکر سے نظم کے سانچے کی تشکیل کی طرف توجہ دی جا سکتی ہے یا نہیں؟ اردو کے نظم نگاروں نے صرف سیاسی مقصد کی اہمیت پر غور کیا، صرف نئے دور کی تلاش کی، آنے والے زمانے کا خواب دیکھا اور دکھایا یا انہوں نے اردو نظم میں کامیاب تجربے بھی کئے اور کئے بھی تو ان کی کتنی نظمیں ایسی ہیں، جنہیں عمدہ شاعری کے خانے میں رکھا جا سکتا ہے؟

یہ سب سوچنے اور غور کرنے کی باتیں ہیں، حالی اور چکبست کی وطن دوستی پر کسے شک و شبہ ہے۔ ان کے خلوص کی تو قسم کھائیے۔ لیکن ان کی عظمت کی تلاش صرف ان کی فکر میں کیوں کی جاتی ہے، حالی اور عظمت اللہ خان نے "اردو نظم کے آہنگ کو ہندوستان کی فضاؤں کی خوشبو دی" ایک نئی غنائیت کو پیدا کرنے کی کوشش کی — کیا اس غنائیت کا تجزیہ اہم نہیں ہے؟ اگر ہم ان کا تجزیہ کریں تو اردو نظم کے المیے کا شدید احساس ہوگا۔

مناظر قدرت، سماجی حالات، قومی شعور، وطن پرستی، انسان دوستی اور آزادی کے مضامین بہت قیمتی اور مقدس ہو سکتے ہیں لیکن اردو نظموں پر سوچتے ہوئے یہ کہنا پڑتا ہے کہ یہ خارجی مضامین نظم کے آرٹ سے زیادہ اہم ہو گئے ہیں اور اسی کی وجہ سے اردو نظم کی بہتر صورت سامنے نہیں آئی ہے۔ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ خارجی مضامین نے اردو نظموں کی صورتوں کو مسخ کر دیا ہے۔ تقریر، عام جذباتی اظہار اور لمحوں میں متاثر کرنے کے انداز نے پیکر نظم کو مکمل طور پر ابھرنے نہیں دیا ہے۔

کل اصلاحی میلان کی ترجمانی نے اردو نظم کے پیکروں کو بار بار مجروح کیا اور آج کچھ برس پہلے جوش اور ترقی پسند شعراء کی خطابت نے اس کے ارتقاء کو نقصان پہنچایا۔ انقلابی امنگ نے نظم کے داخلی آہنگ کو قائم رہنے نہ دیا۔ جوش اور بہت سے نامور ترقی پسند نظم نگاروں کی نظموں سے آپ چاہیں تو کئی کئی بند نکال سکتے ہیں، خیال

پر کوئی اثر نہ ہوگا۔ خطابت لمحوں کے تقاضے کے لئے ہے۔ بعض شعراء کے ہاں صحیح انقلابی
آہنگ کے باوجود اس پورے دور کی نظموں کا آپ انتخاب کریں تو داخلی کرب اور تیکنیکی
اور فنی خوبیوں کے پیش نظر بہت کم نظموں کا انتخاب کر سکیں گے، انتہا پسندی یہاں بھی ہے۔

ترقی پسند ادب میں بھی نظموں کا مطالعہ کرتے ہوئے آپ کو کچھ نظموں کو
صرف "تاریخی اہمیت" کا لیبل لگا کر ایک جگہ رکھنا ہوگا۔ نظموں کی ایک خاص تعداد کو آپ
نظم کہنا نہ چاہیں گے۔ کچھ نظموں کا انتخاب کر کے آپ کو اطمینان ہوگا۔ آپ جانتے ہیں بعض
ترقی پسند شاعروں نے تقریروں کو دور رکھا اور روایات کے جانے پہچانے تصورات
کو اپنایا، یہ گریز شعراء کے بنیادی رجحان کے مطابق بھی تھا۔ ان کی نظمیں متاثر کرتی ہیں اور
شاید اس لئے زیادہ کہ ہم اپنی ادبی روایات سے ذہنی طور پر زیادہ وابستہ ہیں۔

دنیا کے کسی بھی ادب میں شاعری کا مطالعہ کریں، معلوم ہوگا کہ ہر عہد
میں منظوم نثر اور منثور نظم کسی نہ کسی صورت میں موجود ہے اور ان میں سے بہت
سی نظمیں کامیاب ترین نظمیں ہیں اور ادبیات میں نمایاں حیثیت رکھتی ہیں۔ نظم اور
نثر دونوں آرٹ کی صورتیں ہیں اور آرٹ کی ہر صورت کو آپ ایک نام تو دے سکتے ہیں
لیکن اسے مجرد اور مطلق نہیں کہہ سکتے اور نہ اسے "مستقل قدریں" سونپ کر اس
کی کوئی مکمل تعریف کر سکتے ہیں، ان کی نثر جیسی ہو سکتی ہیں، کئی نثری ڈرامے آپ نے پڑھے
ہوں گے جن کا انداز اور جن کے آہنگ کو آپ شاعری کے انداز اور آہنگ سے
علیحدہ نہیں کر سکتے۔ اسی طرح منظوم ڈراموں میں ادبی نثر کا حسن اور ادبی نثر کا آہنگ
ملتا ہے۔ سب مل کر ایک صورت بناتے ہیں۔ اس بات کو ذہن میں ضرور رکھئے زبان
کے استعمال سے آپ فرق محسوس کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر نثر کے آرٹ کا آہنگ
شعر کے آرٹ کے آہنگ کی طرح تیز ہو جاتا ہے تو ہم اسے ادبی نثر کہتے ہیں۔ اسی طرح شعر
کی زبان حاوی ہو جاتی ہے، اس کا آہنگ تیز ہو جاتا ہے تو ہم اسے شاعری کہتے ہیں۔ بات
"آنچ" کی ہے۔ آہنگ کو شعوری طور پر ایک دوسرے پر غالب کر دینے سے دبا ہوا آہنگ
کمزور ہو جاتا ہے۔ دنیا کے ہر ملک میں شاعری اور نثر نگاری کی تاریخ میں یہ باتیں ملتی
ہیں۔ اس سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ "تقریروں" کو منظوم کرنے اور انہیں
سپاٹ طریقے سے پیش کرنے اور ان پر الگ سے استعاروں اور تشبیہوں سے پلاسٹر

کرنے کی جو کوششیں ہوتی ہیں، دراصل وہاں سے پریشانی شروع ہوتی ہے عام اور سامنے کی چیزوں کو شعری پیکروں میں دکھانا اور تخلیق کے کرب سے گزرنا اور تجربوں کو احساس اور جذبے میں گھلانا دو الگ الگ باتیں ہیں۔

ساغر نظامی، سکندر علی وجد، ظہیر کاشمیری، وامق جونپوری، باقر مہدی وغیرہ کی نظموں کا مطالعہ کرتے ہوئے میرا جی، اختر الایمان، فیض، راشد، ابن انشاء، مجید امجد خلیل الرحمان اعظمی، مختار صدیقی، شہریار، کمار پاشی، محمد علوی اور قاضی سلیم وغیرہ کی نظموں کا مطالعہ کیجئے تو یقیناً کچھ دلچسپ حقائق اور نتائج سامنے آئیں گے۔ ان نظموں کے متعلق آپ کیا سوچ رہے ہیں جو "منظوم" ہیں منثور نہیں ہیں۔ لیکن انہیں نظم کہنے پر اس لئے مجبور کیا جا رہا ہے کہ ان میں "مقاصد" بھی ہیں اور قافیہ، ردیف، استعاروں اور محاوروں کا پورا پورا خیال رکھا گیا ہے۔

کل تک نظم نگاروں کی زبان عہد کی زبان سے قریب تھی، ان کے ہیئتی ڈھانچے اجنبی نہ تھے، جو اجنبی تھے وہ زیادہ متاثر نہ کر سکتے تھے، میرا جی اپنے دور میں مقبول نہ ہوئے (مقبولیت کا نام معیار بھی غریب۔ بنانے ہیں) اس کی ایک بڑی وجہ یہی تھی ان کا لہجہ اپنے عہد کے لہجے سے الگ الگ نظر آ رہا تھا، ہم جو روایت پرست اور روایت پسند تھے اس زبان اور لہجے کو کس طرح استقبال کر سکتے تھے؟ حالانکہ یہ شاعری اپنے وقت کی سچی شاعری تھی آج بھی سچی چاندی کی طرح چمک رہی ہے۔ میرا جی کی شاعری اس زمانے میں بہت سے شاعروں کے کلام سے زیادہ زندگی کا داخلی اور خارجی شعور دے رہی تھی۔

نئی اردو نظم بنے بنائے ہیئتی سانچوں سے گریز کر رہی ہے، تجربوں کے انفرادی آہنگ پر نئے نظم نگاروں کی نظر ہے۔ روایتی فکر اور روایتی انداز سے نئی نظم الگ ہو رہی ہے۔ اردو نظم کے المیے کے پیش نظر یہ باتیں اہم ہیں۔ اس آرٹ میں نئی تخلیق کا انتظار کرنا چاہیئے۔ بعض نئے شعراء کی نظموں کے مطالعے سے اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اردو نظم کا المیہ اپنی روایتی قدروں کے ساتھ اب بھی موجود ہے۔

انتخاب اردو ادب

وادیٔ کشمیر میں طلوعِ آزادی کے بعد تخلیق
کئے گئے اردو ادب کی ایک معتبر انتھولوجی
ہے جس کے صفحات کی ورق گردانی سے آزادی
کے بعد کشمیر میں اردو ادب کے کیف و کم ــــ اس کی
نوزائیدگی اور اس کے ارتقا کی ایک واضح تصویر اُبھرتی
ہے۔ نور شاہ کی ترتیب و تہذیب اور مقدمے کے
ساتھ دیدہ زیب طباعت سے آراستہ

قیمت مجلد ۲۵۔۱۰ روپے

اردو کشمیری فرہنگ حصہ دوم

اس میں تقریباً بارہ ہزار الفاظ شامل ہیں۔ دیدہ زیب
طباعت سے آراستہ۔ مجلد ۱۵-۷۰ روپے

کشمیری کشمیری ڈکشنری، جلد دوم

اس میں پانچ ہزار کے قریب الفاظ درج ہیں
دیدہ زیب طباعت سے آراستہ مجلد قیمت ۱۱.۹۵ روپے

کلیات صمد میر

کشمیری زبان کے مشہور صوفی شاعر صمد میر کے کلام
کا مستند مجموعہ جس میں اُن کا بیشتر غیر مطبوعہ کلام
بھی شامل ہے۔ قیمت: ۹ روپے

مشتاق سلطانپوری

تنم گلے ز خیابانِ جنّتِ کشمیر

ڈاکٹر سر محمد اقبال "جنّتِ کشمیر" ہی کے "خیابان" کے ایک گل سرسبد تھے۔ اس بات کا اظہار کشمیر سے اُن کی بے پناہ محبّت اور اس کے درد سے اُن کے بار بار تڑپنے میں ہوتا ہے۔ جس کے ثبوت و شواہد اُن کے اپنے کلام اور اُن کے خطبات و خطوط میں تلاش کئے جا سکتے ہیں۔ وہ اس وادیٔ گلپوش کے حسن سے حد درجہ متاثر تھے۔ یہاں کے خوبصورت نظاروں کی تصویر کشی اُن کی کتاب 'پیامِ مشرق' کے ان اشعار میں ملتی ہے ؎

رخت بہ کاشمر کُشا کوہ و تل و دمن نگر
سبزہ جہاں جہاں بہ بین لالہ چمن چمن نگر
لالہ ز خاک بر دمید موج بہ آبجو تپید
خاک شرر شرر بہ بین آب شکن شکن نگر
دخترکے برہمنے لالہ رُخے سمن برے
چشم بروے اوکشا باز بہ خویشتن نگر

'دخترکے برہمنے' میں گوشت و پوست کا وجود رکھنے والی ہوشِ ربا نازنین کے علاوہ خود اس حسین و جمیل وادی کا علامتی اظہار ہے اُنہوں نے یہاں کے "برہمن زادہ" ہونے پر ہمیشہ فخر کیا ہے۔ لیکن وہ ایسے

برہمن زادہ ہیں جو "رمز آشنائے روم و تبریز" بھی ہو سکتے ہیں۔ اس برہمن زادگی کے ثبوت ہیں اُن کے ہم عصر مورخ، شاعر اور ادیب محمد الدین فوق اپنے ایک مضمون جو ماہنامہ "کشمیری میگزین" میں چھپا تھا، یوں رقمطراز ہیں: "شیخ صاحب کو کشمیری پنڈتوں کے ایک قدیم خاندان سے تعلق ہے جس کی ایک شاخ اب تک کشمیر میں موجود ہے۔ شیخ صاحب کے جد اعلیٰ تقریباً دو سو سال ہوئے کہ مسلمان ہوئے تھے۔ گوت اُن کی سپرو ہے۔ ان کے بزرگوں کا اسلام پر ایمان لانا ایک ولی کے ساتھ عقیدت کی وجہ سے ہوا۔"

"کشمیری میگزین" کے ایک مضمون "چند منٹ عالم جنوں میں" جو انہوں نے ابو ظفر کے فرضی نام سے لکھا تھا، میں اہل کشمیر پر زور دیا تھا کہ وہ بےچارگی اور افسردگی کے عالم سے نکل آئیں اور ناامیدی، حزن و یاس اور بےعملی کو ترک کر کے جدوجہد کی راہ پر گامزن ہو جائیں۔ اس مضمون میں انہوں نے صاف طور پر فرمایا کہ "تمہیں معلوم ہے میں کون ہوں؟ میں کشمیری ہوں" اس زمانے میں وہ وکالت کے ساتھ ساتھ اہل کشمیر کے سود و بہبود سے متعلق ہر تحریک میں حصہ لیتے رہے۔

علامہ اقبال نے اپنی عملی سیاسی زندگی کا آغاز بھی مسائل کشمیر حل کرنے کی کوشش سے کیا۔ دوران وکالت وہ "انجمن کشمیری مسلمانان لاہور" کے جنرل سیکریٹری رہے۔ یعنی اُن کے دردمند اور حساس دل میں سب سے پہلے جس قوم کے لئے ہوک اُٹھی وہ کشمیری تھے۔ اُن کی تنظیم "انجمن کشمیریاں" کی تعلیمی ترقی، اخلاقی اصلاح اور سماجی شعور" کے لئے انتھک کوشش کر رہی تھی۔ اس سلسلہ میں جب جموں جو اسی ریاست کا ایک حصہ ہے، میں بھی "انجمن کشمیریاں جموں" قائم ہوئی اور کچھ عرصہ کام کرنے کے بعد باہمی رشک و رقابت کا شکار ہو گئی تو اقبال کو انتہائی صدمہ ہوا۔ انہوں نے "انجمن کشمیریاں جموں کا حشر" مضمون اس شعر سے شروع کر کے لکھا۔

ایک وہ ہیں جو نیا رنگ جما لیتے ہیں
ایک ہم ہیں کہ بنا کر بھی مٹا دیتے ہیں

دو سال سے کچھ زائد عرصہ گزرا کہ راقم الحروف نے میگزین کے
توسط سے "انجمن کشمیریاں جموں کے انعقاد کی خوشخبری اپنے بھائیوں کو سنائی
تھی اور بانیان و حامیان انجمن کے سرسبز اور نہایت مفید ثابت ہونے کا خیال ظاہر
کیا تھا اور خداوند ذوالجلال سے اس کی عمر درازی اور ترقی پذیر ہونے کے لئے
بعد عجز و نیاز دعا کی تھی۔ افسوس ہزار افسوس کہ اس دعا کی درِ اجابت تک رسائی
نہ ہوئی اور خاکسار کا خیال غلط نکلا۔ ہائے وہ اٹھتا ہوا بلا کا جوش کدھر گیا اور
وہ غیر معمولی سرگرمی کدھر گئی؟"

بار ایٹ لا، کیا ہوا شخص، وکالت میں کامیابی کی پریاں آغوش
وا کئے ہوئے، پیشہ کی پُر لطف دلچسپیاں، علمی مشاغل اور تخلیقی کاوشیں اس
کے باوجود اس بے چارہ دور ماندہ قوم کے لئے وقت نکالنا دردِ دل کا ثبوت
نہیں تو اور کیا ہے۔

اسی زمانے میں یہاں پرتاپ سنگھ حکومت کا ظلم زوروں پر تھا
بقول پریم ناتھ بزاز "جب پرتاپ سنگھ تخت نشین ہوا اس وقت ڈوگرے
وادی کشمیر پر تقریباً چالیس سال تک حکومت کر چکے تھے۔ اس کے باوجود انہوں
نے وادی میں امن و امان قائم کرنے کی طرف توجہ نہ دی اور نہ کچھ عوام کی بھلائی کے
لئے کر کے دکھایا، جسم و جان اور ذہن و فکر کے اعتبار سے عوام کی حالت گر چکی تھی"
اس صورتِ حال پر کشمیری میگزین میں اقبال کی یہ رباعیات دیکھئے ؎

ظلم کہتے ہیں وطن اپنا نہ جن سے چھٹ سکا
شکوہ حکام پر اے دل نہیں تیرا بجا
کیا عجب کشمیر میں رہ کر جو ہے اُن پر جفا
پائے گل اندر چمن دائم پر است از خارہا

○

پنجۂ ظلم و جہالت نے برا حال کیا + بن کے مقراض ہمیں بے پر و بے بال کیا
توڑ اس دستِ جفاکش کو یا رب جس نے + روحِ آزادیٔ کشمیر کو پامال کیا

۱۹۳۱ء میں جب یہاں تحریکِ آزادی کا آغاز ہوا اور سنٹرل جیل کا واقعہ پیش آیا تو اقبال نے آل انڈیا مسلم کانفرنس میں اپنی صدارتی تقریر میں اس تحریک کو ایک نئے دور کا پیش خیمہ قرار دیا اور امید کی کہ یہ ڈوگرہ حکومت کی شکست کا آغاز ہے۔

انہیں ہر اس چیز سے ہمدردی تھی جو اہلِ کشمیر کے کسی مسئلے سے متعلق ہوتی، ہر اس تحریک کے حامی تھے جو کشمیر کی فلاح سے تعلق رکھتی۔ ہر اس بات پر ہمہ تن گوش ہوتے جس میں کشمیریوں کا ذکر ہوتا۔ سیاسی، معاشرتی، تمدنی، اصلاحی، اقتصادی، تعلیمی غرضیکہ یہاں کے تمام معاملات سے دلچسپی تھی۔ جب مہجور نے "تذکرہ شعرائے کشمیر" لکھنا چاہا تو اقبال نے انہیں اپنے ایک خط میں لکھا: "مجھے یہ معلوم کر کے کمال مسرت ہوئی کہ آپ تذکرہ شعرائے کشمیر لکھنے والے ہیں۔ میں کئی سالوں سے اس کے لکھنے کی تحریک کر رہا ہوں مگر افسوس کسی نے توجہ نہ کی۔ آپ کے ارادوں میں اللہ تعالیٰ برکت دے۔

افسوس ہے کہ کشمیر کا لٹریچر تباہ ہو گیا۔ اس تباہی کا باعث زیادہ تر سکھوں کی حکومت اور موجودہ حکومت کی لاپروائی اور نیز مسلمانوں کی غفلت ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ وادیٔ کشمیر کے تعلیم یافتہ مسلمان اب بھی موجودہ لٹریچر کی حفاظت کے لیے ایک سوسائٹی بنالیں۔ ہاں تذکرہ کشمیر لکھتے وقت مولانا شبلی کی شعر العجم آپ کے پیشِ نظر رہنی چاہیے۔ محض حروفِ تہجی کی ترتیب دے کر شعرا کا حال لکھ دینا کافی نہ ہوگا۔ کام کی چیز یہ ہے کہ آپ کشمیر میں فارسی شعرا کی تاریخ لکھیں۔ مجھے یقین ہے کہ ایسی تصنیف نہایت بار آور ثابت ہوگی۔ اگر کبھی خود کشمیر میں یونیورسٹی بن گئی تو فارسی زبان کے نصاب میں اس کورس کا ہونا یقینی ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ کشمیر کی قسمت عنقریب پلٹا کھانے والی ہے۔"

جناب شیخ محمد عبداللہ نے جب ایک بار انہیں مسلم کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی اور وہ کسی وجہ سے شریک نہ ہو سکے تو اپنے معذرتی خط میں لکھا:

"آپ کا والا نامہ ابھی ملا ہے۔ مسلم کانفرنس کے اخبار پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ مجھے یقین ہے کہ بزرگانِ کشمیر بہت جلد اپنے معاملات

سلجھا سکیں گے۔ آپ کی کامیابی کے لئے میں ہر لحظہ دست بدعا ہوں اور یقین رکھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے آپ کی مساعی کو بارآور کرے گا۔ لیکن اختلاف آپ کے مقاصد کی تکمیل میں بڑی رکاوٹ ہوگا۔ ہم آہنگی ہی ایک ایسی چیز ہے جو تمام سیاسی و تمدنی مشکلات کا علاج ہے"

کشمیریوں کے مقدّمات کی پیروی کے لئے یا تو خود کربستہ ہوتے یا اپنے دوستوں کو آمادہ کرتے۔ اپنے دوست نعیم الحق صاحب کو ایک خط میں لکھتے ہیں: "میں سمجھتا ہوں اس مقدمہ کی پیروی کا بار بھی آپ پر ہی ڈالنا آپ کو حد درجہ زحمت میں مبتلا کرتا ہے۔ جہاں تک آپ کے مددگار کا تعلق ہے، میں لاہور ہی میں کسی کو آمادہ کروں گا تاکہ وہ لاہور ہی سے آپ کے ساتھ ہوجائے یا پھر جموں میں آپ سے آن ملے۔ جموں کانفرنس آپ کی میزبان ہوگی۔ آپ شیخ عبدالحمید صاحب کو تحریر کردیں۔ میں نے شیخ محمد عبداللہ صاحب صدر کانفرنس سے بھی تذکرہ کردیا ہے"۔

انہوں نے نہ صرف اپنے شعلہ بار اشعار سے کشمیریوں کے دلوں کو گرمایا بلکہ اپنے خطبوں میں بھی اپنی شیوا بیانی اور شعلہ مقالی سے یخ بستہ قلوب کو پگھلایا۔ یہاں کے لوگوں کی زبوں حالی دیکھ کر ان سے کسی بھی حال میں چپ نہیں رہا جاتا۔ وہ خواب خرگوش میں پڑے لوگوں میں بیداری کا نیا ولولہ پیدا کر دیتے ہیں۔ اس طرح کہ ان میں زندگی کی نئی امنگ اور ترنگ کروٹیں لینے لگتی ہے۔ انہوں نے کشمیریوں کی بیداری پر ۱۹۳۲ء کی مسلم کانفرنس کی صدارتی تقریر میں یوں تبصرہ کیا:

"جہاں تک کشمیر کا تعلق ہے۔ مجھے ان واقعات کے تاریخی پس منظر میں جانے کی ضرورت نہیں جو حال ہی میں رونما ہوئے ہیں۔ ایسی قوم کا دفعتاً جاگ اٹھنا جس میں شعلۂ خودی بجھ چکا ہو۔ غم اور مصائب کے باوجود ان لوگوں کے لئے مسرت کی بات ہے جو ایشیائی قوموں کی اندرونی کشمکش سے واقف ہیں۔ کشمیر کی تحریک انصاف پر مبنی ہے اور مجھے کوئی شبہ نہیں کہ اس ذہین اور صناع قوم میں اپنی شخصیت کا احساس نہ محض ریاست بلکہ تمام ہندوستان کے لئے طمانیت کا باعث ہوگا"۔

سنہ ۱۹۳۳ء میں جب آزادی کی آواز اُٹھنے پر حکومت نے جبر و تشدد سے کام لیا۔ یہاں کے رہنماؤں کو جیل کی تنگ و تاریک کوٹھریوں میں بند کر دیا اور لوگوں پر ظلم و جبر کا حصار اور تنگ کر دیا گیا تو اقبال نے ایک پبلک بیان میں فرمایا:

"کشمیر گورنمنٹ کے تازہ ترین اعلامیہ میں تبلایا گیا ہے کہ سری نگر میں اب حالات پُر سکون ہیں۔ لیکن جو اطلاع مجھے معتبر ذرائع سے ملی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حالات اتنے اچھے نہیں ہیں جتنے کہ سرکاری اعلامیہ میں بتائے گئے ہیں..... حکومت کشمیر کے ایک تازہ اعلامیہ میں دُنیا کو بتایا گیا ہے کہ مسلم جماعتوں[1] کے لیڈروں کی گرفتاری کابینہ کے متفقہ فیصلہ کے مطابق عمل میں لائی گئی تھی۔ ایک معتبر خبر کے ذریعے جو مجھے اپنے طور پر موصول ہوئی ہے، اس بیان میں کوئی صداقت نظر نہیں آتی۔ حکومت کشمیر کی سفاکی، درندگی اور بربریت سے اس طرح پردہ سرکایا جاتا ہے۔" "میں کشمیر کی کسی سیاسی جماعت کی بلاوجہ حمایت نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن دونوں جماعتوں کے لیڈروں کی گرفتاری، لوگوں پر دُرّوں کی بارش اور عورتوں اور بچوں پر گولی چلانا اور لاٹھی چارج ایسے واقعات ہیں جو کشمیر کو پھر ان مصیبتوں میں ڈال دیں گے، جن سے کرنل کالون[2] نے اپنی حکمت عملی سے نجات دلائی تھی۔" انتشار و افتراق کے خطرناک نتائج سے یوں آگاہ کرتے ہیں، "میں مسلمانان کشمیر سے استدعا کرتا ہوں کہ وہ ان تحریکوں سے خبردار رہیں جو ان کے خلاف کام کر رہی ہیں اور اپنے درمیان اتفاق اور اتحاد پیدا کریں۔ کشمیر میں ابھی بیک وقت دو یا تین اسلامی سیاسی جماعتوں کے کام کرنے کا وقت نہیں ہے وقت کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ ریاست میں مسلمانوں کی نمائندہ صرف ایک ہی جماعت ہو۔"[3]

---

[1] کشمیر میں سیاسی تحریک کی شروعات سب سے پہلے مسلمانوں کے ذریعے ہوئی۔ یہ مسلم کانفرنس کا زمانہ تھا۔

[2] کرنل کرنولن کو حکومت ہند نے وزیر اعظم بنا کر کشمیر بھیجا تھا۔

[3] اقبال اور سیاست ملی۔

کشمیریوں کی امداد کے لئے پنجاب میں کئی جماعتیں بن گئی تھیں جیسے مجلس احرار کشمیر کمیٹیاں وغیرہ۔ ایک کشمیر کمیٹی کے صدر اقبال تھے اور دوسری کشمیر کمیٹی کے صدر غالباً مرزا بشیر الدین محمود صاحب۔ اس میں قادیانی اصحاب بھی شریک تھے۔ لیکن افسوس کہ ان جماعتوں نے آپسی رشک و رقابت میں پڑ کر کوئی اہم کام انجام نہ دیا۔ یہ حال دیکھ کر اقبال نے ایک کمیٹی کی صدارت سے استعفیٰ دے دیا۔ اس کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے۔ "پچھلے ہفتہ کے آخری دنوں میں کمیٹی کا ایک اور جلسہ ہوا۔ اس میں ممبران کے سامنے نظام کا مسودہ پیش کیا گیا جس کی غرض و غایت یہ تھی کہ کمیٹی کی حیثیت ایک نمائندہ جماعت کی سی ہو۔ لیکن ممبران نے اس سے اختلاف ظاہر کیا۔ البتہ بحث و مباحثہ اور گفتگو سے مجھے اندازہ ہوا کہ یہ لوگ دراصل کمیٹی کو دو ایسے حصوں میں تقسیم کرنا چاہتے ہیں جس میں اتحاد صرف برائے نام ہی ہوگا۔"

ایک کمیٹی کے ذریعے اگر مقاصد پورے ہوتے نظر آتے دکھائی نہیں دیتے تو وہ مشورہ دیتے ہیں کہ "موجودہ کشمیر کمیٹی کو ختم کر دیا جائے۔" لیکن ان کے مقاصد کے حصول کے لئے وہ ایک تنظیم کا قیام ناگزیر سمجھتے ہیں۔ "اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مسلمانان کشمیر کی رہنمائی اور مدد کے لئے برطانوی ہندمیں ایک کشمیر کمیٹی ضرور ہونی چاہیئے۔"[۲]

حکومت ہند نے کشمیر کی سیاسی صورت حال کا جائزہ لینے کے لئے جو گلانسی کمیشن مقرر کیا تھا اس کی رپورٹ اگرچہ تسلی بخش نہیں تھی۔ تاہم کسی قدر فائدہ پہنچا سکتی تھی علامہ نے اس سے متعلق ۳ راگست ۱۹۳۲ء کو فرمایا۔ "ہندوستان کے لوگ اس اعلامیہ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ امید ہے کہ گلانسی کمیشن کی سفارشات پر بہت جلد عمل شروع ہو جائے گا اور اس طرح حکومت کشمیر ان لوگوں کے دلوں میں جن کے لئے یہ اصلاحات منظور کی گئی ہیں، اپنا اعتماد پیدا کرنے میں کامیاب ہو جائے گی۔"[۳]

وہ نہ صرف یہ کہ کشمیر کی عملی سیاست میں ذوق و شوق سے حصہ لیتے تھے۔ اس خطہ ارضی پر ظلم ڈھانے والوں پر عرصہ حیات تنگ کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ بلکہ معاملات سلجھانے کے لئے انہیں اپنے زریں مشورے بھی دیتے تھے۔ ریاست کے وزیر اعظم مسٹر کالون کو ایک مدبرانہ مشورہ دیتے ہوئے فرماتے ہیں۔ "وزیر اعظم کشمیر مسٹر کالون کو

---

[۲] اقبال اور سیاست ملی۔ از رئیس احمد جعفری۔ صفحہ نمبر ۳۰۳

[۳] اقبال اور سیاست ملی۔ از رئیس احمد جعفری

میں یہ مشورہ دوں گا کہ حکومت اور عوام میں دوبارہ اعتماد اور اچھے تعلقات پیدا کرنے کے
لئے وہ میرپور اور بارہ مولہ میں زیر سماعت فوجداری مقدمات کو واپس لے لیں۔ یہ اقدام
حکومت کشمیر اور وزیر اعظم کے وقار کو بڑھانے میں بہت مؤثر ثابت ہوگا اور اس طرح وہ
پروپیگنڈا بھی بند ہو جائے گا جو آجکل وزیر اعظم کے خلاف ہو رہا ہے۔"

ان تمام اقتباسات سے یہ امر آئینہ ہو جاتا ہے کہ انہوں نے کشمیر کی مظلومیت
کے خلاف نہ صرف اپنے الفاظ سے ناوک فگنی کا کام لیا بلکہ عملاً جو کچھ ممکن ہو سکتا تھا کر دکھانے
میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ ان کے جملوں اور منثور عبارتوں میں ممکن ہے رہیں وہ
جادو بیانی اور تاثیر کی شدت نہ ملے جو ان کے اشعار کا خاصہ ہے۔ کیوں کہ وہ اصل میں اس
جہانِ آب و گل میں طبعاً ایک شاعر کا قلب و جگر اور زبان و بیان لے کر آئے تھے باوجود
اس کے اس بات کی تہ تک پہنچنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی کہ جو لوگ ان کی شاعرانہ
سحر طرازی کو سمجھنے کے اہل نہ تھے یا جن موقعوں پر اس سے کام لینا فائدہ مند ثابت نہ ہو سکتا
تھا، وہاں وہ اپنی نثر سے کام لینے میں کبھی نہیں ہچکچاتے۔

یہ تھا کشمیر کی تقدیر بدلنے کے لئے عملی میدان میں ان کا حصہ۔ اب اپنے
ان کی شاعری کی جانب۔ خود علامہ اقبال کا ایک شعر ہے۔

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کی

جب تک مظلوم لوگ خود ظلم کے خلاف اٹھ کھڑے نہیں ہوتے،
ان میں احساس ذات پیدا نہیں ہوتا وہ اپنے گرد و پیش کا جائزہ لے کر اپنی پریشان
حالی کے اسباب ڈھونڈتے ہوئے اپنے دکھوں کا مداوا نہیں ڈھونڈتے، خواب غفلت
سے جاگ کر سامان سفر تیار کر کے ترقی کی منزل کی طرف نہیں بڑھتے، کوئی سہارا، کوئی
حمایت، کوئی رہنما ان کے کام نہیں آسکتا۔ اقبال کشمیریوں کے دل میں یہ احساس پیدا کرنا
چاہتے ہیں۔ ارمغان حجاز میں "ملازادہ ضیغم لولابی کا بیاض" کے عنوان سے اشعار
کا ایک قابل قدر حصہ ملتا ہے۔ وہ غیر محسوس طریقے پر ایک ماہر نفسیات کی طرح
پہلے لولاب کی تعریف کرتے ہیں اور پھر مقصد کی کڑوی دوا شہد ملا کر بیمار کے

گلے سے اُتارنا چاہتے ہیں ؎

پانی ترے چشموں کا تڑپتا ہوا سیماب
مرغانِ سحر تیری فضاؤں میں ہیں بیتاب
اے وادیٔ لولاب

گر صاحبِ ہنگامہ نہ ہو منبر و محراب
دین بندۂ مومن کے لئے موت ہے یا خواب
اے وادیٔ لولاب

ہیں ساز پہ موقوف نوا ہائے جگر سوز
ڈھیلے ہوں اگر تار تو بے کار ہے مضراب
اِے وادیٔ لولاب

بیدار ہوں جس کی فغاں سحری سے
اس قوم میں مدت سے وہ درویش ہے نایاب
اے وادیٔ لولاب

اور ایسے درویش کی تمنا کرتے ہوئے وہ اس قوم کو غلامی کی ذِلّت کا احساس دِلاتے ہیں ؎

موت سے ہے سخت تر جس کا غلامی ہے نام
مکر و فنِ خواجگی کاش سمجھتا غلام
اے کہ غلامی سے ہے رُوح تری مضمحل
سینۂ بے سوز میں ڈھونڈ خودی کا مقام

کشمیری قوم کو اس طوق کے نکال پھینکنے کی جرأت بخشتے ہوئے اُن کو ماضی کی یاد دلاتے ہیں اور خدا سے روزِ مکافات کی دعا مانگتے ہیں ؎

آج وہ کشمیر ہے محکوم و مجبور و فقیر
کل جسے اہلِ نظر کہتے تھے ایرانِ صغیر
آہ یہ قومِ نجیب و چرب دست و تر دماغ
ہے کہاں روزِ مکافات اے خدائے دیر گیر

وہ اس قوم کو جہدِ عمل پر آمادہ کرتے ہوئے اُمید افزا پیغام یوں سناتے ہیں ؎

گرم ہو جاتا ہے جب محکوم قوموں کا لہو
تھرتھراتا ہے جہانِ رنگ و بو د چار سو
ضربتِ پیہم سے ہو جاتا ہے آخر پاش پاش
حاکمیت کا بتِ سنگیں دل و آئینہ رو

وہ خود کشمیریوں کی تحریکِ آزادی سے مطمئن ہوتے ہیں۔ اُن کی خوشی کی انتہا نہیں رہتی کہ اس مردہ دل قوم میں بھی زندگی کے آثار پیدا ہو گئے ؎

فطرت کے تقاضوں سے ہوا حشرِ پہ مجبور
وہ مردہ کہ تھا بانگِ سرافیل کا محتاج

آزادی کی قیمت کا احساس یوں دیا ہے ؎

خودگیری و خودداری و گلبانگِ انا الحق
آزاد ہو سالک تو ہیں یہ اس کے مقامات
محکوم ہو سالک تو یہی اس کا ہمہ اوست
خود مردہ و خود مرقد و خود مرگِ مفاجات

وہ کشمیری خون کی گرمی سے ہرگز نا اُمید نہیں ؎

جس قوم کے ضمیر میں ہو آتشِ چنار
ممکن نہیں کہ سرد ہو وہ خاکِ ارجمند

مردِ حُر یعنی آزاد بندے کی صفت یہ بتائی ہے ؎

آزاد کی رگ سخت ہے مانندِ رگِ سنگ
محکوم کی رگ نرم ہے مانندِ رگِ تاک
آزاد کی دولت دلِ روشن نفسِ گرم
محکوم کا سرمایہ فقط دیدۂ نمناک

اس قوم کی بیداری کے لئے اور انہیں صحیح نصب العین کی طرف لے جانے کے لئے موزوں رہنما کی دُعا کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

نصیب خطہ ہو یارب وہ بندۂ درویش
کہ جس کی فقر میں انداز ہوں کلیمانہ

اس قوم کی صلاحیتوں کا اعتراف اس شعر میں ملاحظہ فرمایئے ؎

چھپے رہیں گے زمانہ کی آنکھ سے کب تک
گہر ہیں آب ولر کے تمام یک دانہ

وہ کشمیری قوم کو ایک زندہ قوم دیکھنا چاہتے ہیں ؎

دگرگوں جہاں ان کے زور عمل سے
بڑے معرکے زندہ قوموں نے مارے

جب تک کوئی قوم اپنے قویٰ سے صحیح کام نہیں لیتی اور راہِ عمل پر گامزن نہیں ہوتی۔ اس کی تقدیر بدلنا ممکن نہیں ؎

تقدیر ہے اک نام مکافات عمل کا
دیتے ہیں یہ پیغام خدایان ہمالہ

وہ افسوس کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

سرما کی ہواؤں میں ہے عریاں بدن اس کا
دیتا ہے ہنر جس کا امیروں کو دوشالہ

اسلاف کا شکوہ حاصل کرنے کے لئے اِن صلاحیتوں کی ضرورت ہے جو اسلاف کا خاصہ رہی ہوں ؎

آں عزم بلند آور آں سوز جگر آور
شمشیر پدر خواہی بازوے پدر آور

اپنے اشعار کو نالہ و فغاں کا نام دیکر اس قوم میں وہی سوز دروں دیکھنا چاہتے ہیں جو خود اُن کے دل میں رقص شرر بنا ہوا ہے ؎

غریب شہر ہوں میں سن تو لے میری فریاد
کہ تیرے سینے میں بھی ہوں قیامتیں آباد

اپنے فارسی کلام میں بھی وہ کشمیریوں کے حال زار پہ آنسو بہاتے ہیں۔ جہاں کشمیر ہمارا ادب

کے خوبصورت نظاروں کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ:

تو گوئی کہ یزداں بہشت بریں را

نہادست در دامن کوہسارے

وہیں یہاں کے مسکینوں پر اس طرح تنقید کرتے ہیں:

کشیری کہ با بندگی خو گرفتہ

بتے می تراشد ز سنگ مزارے

ضمیرش تہی از خیال بلندے

خودی ناشناسے ز خود شرمسارے

بریشم قبا خواجہ از محنت او

نصیب تنش جامۂ تار تارے

(پیام مشرق)

آخر یہ آرزو کرتے ہیں کہ اس خاک سے انگارے اٹھیں

ازاں مے فشاں قطرۂ بر کشیری

کہ خاکسترش آفریند شرارے

کشمیر سے متعلق علامہ اقبال کی مشہور نظم جاوید نامہ میں ملتی ہے۔ "آں سوئے افلاک" کے عنوان کے تحت وہ امیر کبیرؒ اور غنیؒ سے اپنی روحانی ملاقات کا تذکرہ کرتے ہوئے فلسفیانہ طور پر کچھ گتھیاں سلجھا کر دعوت فکر دینے والے نکتے ابھارتے ہیں حضرت میر سید علی ہمدانیؒ نے ذکر یوں کیا ہے:

مرشد آں کشور مینو نظیر

میر و درویش و سلاطین را مشیر

خطہ را آں شاہ دریا آستیں

داد علم و صنعت و تہذیب و دیں

آفرید آں مرد ایران صغیر

با ہنر ہائے غریب و دلپذیر

علامہ ان سے ایک ضروری استفسار کرتے ہیں ؎

از تو خواہم سرِ یزداں را کلید
طاعت از ما جُست و شیطاں آفرید
از تو پرسم ایں فسوں سازی کہ چہ
با قمار بدنشیں بازی کہ چہ

حضرت امیر جواب میں فرماتے ہیں ؎

بزم با دیو است آدم را وبال
رزم با دیو است آدم را جمال

اس کے بعد علامہ، کشمیریوں کی حالت زار امیر سے یوں بیان کرتے ہیں؟

حالِ ز اہلِ خطہ سوز و چوں سپند
خیزد از دل نالہ ہائے دردمند
کاروانہا سوئے منزل گام گام
کارِ او ناخوب و بے اندام خام
از خودی تا بے نصیب افتادہ است
در دیار خود غریب افتادہ است
از غلامی جذبہ ہائے او بُرد
آتشے اندر رگِ تاکش فسرد

وہ حضرت امیر کبیر کو کشمیریوں کے ماضی کی یاد دلاتے ہیں ؎

در زمانے صف شکن ہم بودہ است
چیرہ و جانباز و پردم بودہ است

اپنے سفرِ کشمیر کو ایک تمثیل کی صورت میں حضرت امیر کی خدمت میں یوں بیان کرتے ہیں ؎

کوہ و دریا و غروبِ آفتاب — من خدا را دیدم آنجا بے حجاب
با نسیم آوارہ بودم در نشاط — بشنو از نے می سرودم در نشاط
مرغکے اندر شاخسار — با پشیزے می نیرزد ایں بہار

ہمارا ادب

عمر ہا گل رخصت بریست وکشاد   خاکِ ما دیگر شہاب الدین نزاد

علامہ حضرت امیر سے کہتے ہیں کہ اس پرندے کی آواز سے مجھ پر عجیب کیفیت طاری ہوئی، اور اسی عالم میں ایک دیوانے نے میرا صبر و ہوش لوٹ لیا جو فریاد کر رہا تھا کہ ؎

بگذر ز باد و نالۂ مستانہ نجوے
بگذر ز شاخِ گل کہ طلسمے است رنگ و بوے

اس دیوانے نے مجھے خوابِ غفلت سے جگایا اور تنبیہ کیا کہ کیوں ان خوبصورت نظاروں میں کھو گئے ہو۔ ان کی اساطہ دلفناہی کیا ہے۔ اسی نے مجھے بتایا کہ جسے تم پرندہ سمجھ رہے ہو یہ ملا طاہر غنی کی روح ہے ؎

این مشت پر کجا و سرود این چنین کجا
روحِ غنی است ماتمِ مرگ آرزوے

وہ فریاد کر رہا تھا ؎

بادِ صبا اگر بہ جنیوا گزر کنی
حرفے ز ما بہ مجلسِ اقوام باز گوے
دہقان و کشت و جوے و خیابان فروختند
قومے فروختند و چہ ارزاں فروختند

حضرت امیر کبیر اس پریشان حال سوال کا جواب دیتے ہوئے پائیدار دولت کے کھو جانے پر افسوس کرنے کی تلقین کرتے ہیں نہ کہ ناپائیدار چیزوں کے کھونے پر۔

حضرت امیر فرماتے ہیں ؎

جسم را از بہرِ جاں باید گداخت
پاک را از خاک می باید شناخت
خویش را نایافتن نابودن است
یافتن خود را بخود بخشودن است

ہر کہ خود را دید و غیر از خود ندید
رخت از زندانِ خود بیرون کشید

علامہ اقبال پھر استفسار کرتے ہیں ؎

گفتہ از حکمتِ زشت و نکوے
پیر دانا نکتۂ دیگر بگوے
مرشدِ معنی نگاہاں بودۂ
محرمِ اسرارِ شاہاں بودۂ
ما فقیر و حکمراں خواہد خراج
چیست اصلِ اعتبارِ تخت و تاج

جواب ملتا ہے ؎

فاش گویم با تو اے والا مقام
باج را جز با دو کس دادن حرام
یا اولی الامرے کہ منکم شانِ اوست
آیۂ حق حجت و برہانِ اوست
یا جوان مردے چو صرصر تند خیز
شہر گیر و خویش باز اندر ستیز
روز کین کشور گشا از قاہری
روزِ صلح از شیوہ ہائے دلبری

اس کے بعد ملا طاہر غنی کی روح جو دربارِ امیر میں نغمہ زن ہوتی ہے۔ اقبال سے مخاطب ہوتی ہے ؎

ہند را ایں ذوقِ آزادی کہ داد
صید را سودائے صیادی کہ داد
آں برہمن زادگانِ زندہ دل
لالۂ احمر ز روے شاں خجل
تیز بین و پختہ کار و سخت کوش
از نگاہِ شاں فرنگ اندر خروش

اصلِ شاں از خاک دامن گیر ماست
مسطلع این اختراں کشمیر ماست
خاک ما را بے شرر دانی اگر
بردرونِ خود یکے بکشا نظر
ایں ہمہ سوزے کہ داری از کجاست
ایں دم بادِ بہاری از کجاست

اس بات کی طرف اشارہ کرنے کے بعد کہ ہندوستان کی تحریک آزادی کون چلا رہے ہیں، وہ لوگ تو ہماری سرزمین کے ہیں۔ اگر اس میں شک ہے تو اپنے آپ سے پوچھئے، آپ کس وطن سے تعلق رکھتے ہیں؟ ملّا طاہر غنی ان اشعار میں اقبال کا حوصلہ بڑھاتے ہیں اور نئے زمانے کے خوش آئند تصور کو یوں امید کی آماجگاہ بناتے ہیں:

اے کہ خواندی خطِ سیمائے حیات
اے بکجا در دادہ غوغائے حیات
دل میانِ سینۂ شاں مردہ نیست
اخگرِ شاں زیرِ یخ افسردہ نیست
باش تا بینی کہ بے آواز صور
ملتے برخیزد از خاکِ قبور
غم مخور اے بندۂ صاحب نظر
برکش آں آہے کہ سوزد خشک و تر
سلطنت نازک تر آمد از حباب
از دمے او را تواں کردن خراب

غنیؔ اقبال سے کہتے ہیں کہ اس جنت میں (جنت میں ایہام ہے یعنی جنت بھی اور کشمیر بھی) نیا انقلاب برپا کر اور جسم میں نئی زندگی کا خون دوڑانے والا نغمہ چھیڑ تا کہ خواب غفلت میں پڑے ہوئے بیدار ہوں

تازہ آشوبے فگن اندر بہشت
یک نوائے مستانہ زن اندر بہشت

اور پھر اقبال کے وہ جھنجھوڑنے والے گراں بہا اشعار ملتے ہیں جن سے شبستانِ وجود میں زلزلہ آتا ہے۔ یہ اشعار ایک طرح سے کشمیریوں کے قوتِ عمل کے لئے مہمیز کا کام دیتے ہیں۔ ان میں اس قوم کی خاطر ایک لائحہ عمل ہے، جہدِ پیہم کا ایک پیغام اپنا سفر تیز تر کرنے کی ہدایت ہے

با نشۂ درویشی در ساز و دمادم زن
چوں پختہ شوی خود را بر سلطنتِ جم زن
گفتند جہانِ ما آیا بتو می سازد
گفتم کہ نمی سازد گفتند کہ برہم زن
عقل است چراغِ تو در راہگزارے نہ
عشق است ایاغِ تو با بندۂ محرم زن
لختِ دلِ پر خونے از دیدہ فرو ریزم
لعلے ز بدخشانے بردار و بخاتم زن

اب یہ بات آئینہ ہوتی ہے کہ اقبال ہمیشہ اس خطے کی کس مپرسی اور تباہ حالی پر خون کے آنسو بہاتے رہے۔ انہیں اس وطنِ عزیز کی پریشاں حالی کسی کل چین نہ لینے دیتی تھی۔ انہوں نے مفکر و رہبر اپنے پیغام سے ہی نہیں بلکہ اپنے عمل سے اس قوم کو بری حالت سے نکالنے کی کوشش کی اور اس بات کو جھٹلایا نہیں جا سکتا کہ کشمیر میں انقلاب لانے اور ایک خاص قسم کے جمود میں تحریک پیدا کرنے میں علامہ اقبال کا حصہ کچھ کم اہمیت کا حامل نہیں۔ خدا کرے کہ اقبال کی یہ دعا بھی مستجاب ہو جائے۔

کہ تا جنبشِ آدمی زادگاں را
رہا سازد از لذتِ انتظارے

پیر محمد افضل مخدومی

نظامتِ کشمیر اور مغل صوبیدار

اکبر اعظم محمد جلال الدین نے بے پناہ قربانیوں اور کوفت کے بعد جنت ارضی کشمیر کو سلطنت ہند میں شامل کیا۔ اس کے لئے وقتاً وقتاً پر ڈپلومیسی، چاپلوسی کے بے شمار دور چلے۔ یہاں تک کہ اپنے تنخواہ دار جاسوسوں کے ذریعہ اندرونی انتشار کو مزید تقویت دینے کے لئے زبردست مہم چلائی گئی۔ کئی لوگ صوفیوں، درویشوں اور عالموں کا لبادہ اوڑھ کر گلشن کشمیر کے باغ کو اجاڑنے کے لئے مذہبی تفرقوں کو فروغ دینے لگے۔ یہاں تک کہ حکومت کے ایوانوں سے جانبداری، تنگ نظری اور تعصب کے تعفن سے چمنِ کشمیر کی فضائے عطر بیز کثافت سے ملوّث ہوئی۔ دربار اکبری میں مسئلہ کشمیر کو نپٹانے کے لئے جو سب کمیٹی تشکیل دی گئی تھی، اس کے اجلاس اور باہمی مشورے آگرہ، دہلی اور لاہور میں ہوا کرتے تھے۔ ایسی تمام سرگرمیوں کا اڈہ لاہور ہی میں مقرر کیا گیا تھا۔ جب حالات نے پلٹا کھایا اور کشمیری مغل اعظم کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہوئے، تو ظاہر ہے کہ صوبیداروں (گورنروں) اور منتظموں کو مقرر کرنے کے لئے کافی احتیاط، تدبّر اور دور اندیشی سے کام لیا گیا ہوگا۔ کشمیری جیسی جنگجو، سرکش اور خود دار قوم کو رام کرنے یا دام تزویر میں پھنسانے کے لئے ایسی شخصیتوں، ایڈمنسٹریٹروں، سیاست دانوں اور عیار لوگوں کی تلاش ہوئی جو ہر نوع کامل مکمل ہوں۔ چنانچہ ۷ ماہ ذی قعدہ ۹۹۴ھ مطابق ۱۵۸۶ء قاسم خان میر بحر کو کشمیر میں سلطنت مغلیہ کا پہلا صوبیدار (گورنر) مقرر

کیا گیا۔ اس نے قابلیت، متانت اور سنجیدگی سے وادئ گلگت میں اکبر اعظم کی سلطنت کو مستحکم بنیاد پر قائم کرنے کی بے حد کوشش کی مگر غیر محرم حکمرانوں کی خوشامد اور چاپلوسی کارگر ثابت نہ ہو سکی۔ مغل اعظم جنت ارضی کشمیر کو دیکھنے کے لئے اس قدر بے تاب تھا کہ بار بار صوبیدار اعلیٰ قاسم خان کو اپنی آمد کے لئے مطلع کرتا رہا۔ یہاں تک کہ اکبر دہلی سے لاہور اسی لئے آیا تھا کہ مفتوحہ جنت کا نظارہ کرے۔ مگر قاسم خان اعلیٰ حضرت ہمایونی کو یہ مشورہ دیتے رہے کہ ابھی اکبر اعظم کے وارد کشمیر ہونے کا وقت نہیں آیا۔ کشمیری غیور اور خونخوار قوم ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ان کی کینہ پروری جذبات میں آ کر سرکشی پر مجبور ہو جائے۔ اکبر اپنی متلون المزاجی اور جلد بازی سے تنگ آ کر قاسم خان میر بحر کو صرف گیارہ مہینے اور پانچ دن کے بعد ہی نظامت صوبیداری سے سبکدوش کرنے پر مجبور ہوا۔

اس کے بعد ایک مانے ہوئے منتظم، فوجی جرنیل سید یوسف خان رضوی ۹۹۵ھ کشمیر کے گورنر مقرر ہوئے یہ صاحب ذوق، علم دوست اور خوش خلق انسان تھے۔ انہوں نے کشمیر کے بزرگوں اور اہل اللہ کے ساتھ رابطہ قائم کیا عقیدت و احترام سے ان کے ہاں جا کر فیوض و برکات حاصل کرتا رہا۔ لوگوں کو فوج اور پولیس کی زیادتیوں سے بچانے کے لئے انہوں نے باغ حسن شاہ میں چھاؤنیاں مقرر کرنے کی ہدایت دی۔ ان دنوں یہ علاقہ پانی اور جنگلوں سے گھرا ہوا تھا۔ یہاں آجکل خانقاہ نقشبندیہ، مرقد حضرت خواجہ معین الدین ہادیؒ اور مزار شہداء ہے۔ مغل سپاہیوں کو سخت تنبیہ کی گئی تھی کہ وہ ہرگز عام شہریوں کے گھروں میں نہ جائیں اور ان کے ساتھ کسی قسم کی چھیڑ چھاڑ نہ کریں، حاکم اعلیٰ رضوی نے اپنے ایک مراسلہ میں مغل اعظم کو لکھا تھا کہ کشمیری سب کچھ معاف کر سکتا ہے۔ لیکن اپنی بہو، بیٹیوں اور ماؤں بہنوں کی بے عزتی اور عصمت ریزی اس کے لئے ناقابل برداشت ہے۔ اسی لئے فوج کو بستیوں سے دور جنگلوں میں بسیرا ڈالنے کی ہدایت ہوتی ہے۔ اسی عہد میں ایک سال بعد اکبر اعظم کی تمنا پوری ہوئی اور وہ ۹۹۶ھ میں وادئ گل پوش میں تشریف فرما ہوئے۔

ان کا پُرتپاک استقبال کیا گیا۔ کشمیر کے دریائی جلوسوں کی ابتدا یہیں سے ہوتی ہے۔
دریائے جہلم کے کناروں کو سلیقے سے سجایا گیا تھا۔ بانڈ اور حافظائیں[1] اپنے
روایتی ناچ نغموں میں مست، لہروں کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر وجد آمیز ترنّم سے سرور
پیدا کر رہے تھے۔ شاندار استقبال کو دیکھ کر اکبر اعظم بے حد محظوظ ہوئے اور اسی
استقبال کے صدقے میں قلعہ اکبری (ہری پربت) تعمیر کرنے کا منصوبہ بنا۔ (جب کہ سیجرف
اور بلگانن نے دریائی جلوس کی "والہانہ عقیدت" کو، دیکھ کر صرف "آواز دینے" کو کہا تھا)
اکبر بے حد عیار، رمز شناس اور وسیع القلب حکمران تھا۔ باوجود ان پڑھ ہونے
کے اس نے اپنے زمانوں میں عالموں، فاضلوں اور صاحب دانش بزرگوں کو خاص
مقام سے نوازا تھا۔ کشمیر میں بھی علمائے عالیین اور شعراء شیریں مقال کی عزت افزائی کی گئی
قریباً تین مہینے قیام کر کے لاہور کی راہ لی۔ دو سال چھ مہینے کے بعد سید یوسف خان رضوی
تبدیل کئے گئے۔

۹۹۷ھ مطابق ۱۵۸۶ء میں رضوی نے صوبیداری کا چارج محمد
قلیج خاں کو دیا۔ یہ بے حد حلیم الطبع، ملنسار تھا ہمیشہ ہشاش وبشاش نظر آتا تھا۔
آجکل بڑے عہدوں پر براجمان لوگ جو ڈپلومیٹک زبان بولتے ہیں۔ اس میں انہیں یدِ طولیٰ
حاصل تھا۔ مشائخین کرام، صوفیائے عظام، شعراء، فقیہہ اور صاحب علم و نظر حضرات سے
الگ الگ مل کر تبادلہ خیال کرنا ان کے معمولات میں شامل تھا۔ چنانچہ اس نے اپنا ایک
وسیع حلقہ احباب قائم کیا تھا۔ اس کی تمنا یہ تھی کہ کشمیر کے بزرگوں، صوفیوں اور دوستانِ
خدا نے باوجود اصرار پیہم ــــ کے کبھی کوئی فرمائش، سفارش نہیں کی۔ بلکہ یہ سب لوگ
غیر مطمئن رہے۔ اس عہد میں بھی اکبر اعظم کشمیر آئے۔ اب کے علاقہ زدنیبرہ میں نزول اجلال
ہوا۔ اور فوجی، خیمہ بردار ہاتھی اور گھوڑے ہزاروں کی تعداد میں عیدگاہ میں جمع ہوئے
شہنشاہ اکبر کی آمد پر کوہ ماران (ہری پربت)، کوہ سلیمان (شنکراچاریہ) دریائے بہت
(جہلم)، مکانوں، چھتوں وغیرہ پر چراغاں کیا گیا۔ سرسبز و شاداب وادی بقعۂ نور بنی تھی۔
اب کے اکبر اعظم تین مہینے اور ۲۷ دن کشمیر میں رہے، اطراف و اکناف کی سیر کی۔ چمن زاروں،
پھلواڑیوں خاص کر پنپور کے زعفران زار دیکھ کر اکبر اعظم ان قدرتی مناظر سے بے

[1] گانے اور ناچنے والی طوائفوں کو کشمیر میں حافظائیں کہا جاتا تھا۔

حد متاثر ہوئے۔ ستر ہزار مہمانوں کو عیدگاہ میں دعوت دی۔ شہاب الدین پورہ کے وسیع سبزہ زار میں ڈیرا ڈال کر مغل اعظم نے کئی دربار منعقد کئے اور عوام کی شکایات سنیں۔ کئی شہریوں نے بادشاہ کے ایک مصاحب کے خلاف یہ شکایت کی کہ اس نے کسی نیک خاتون کی عصمت دری کی۔ بعد ثبوت اس شخص کو اسی وقت تختۂ دار پر لٹکایا گیا۔ کشمیریوں کے تالیف قلوب میں اکبر اور اس کے صوبیداروں نے بزعم خود انتہائی کوششیں کیں۔ لیکن جغرافیائی حدود اور طرز معاشرت کی بنا پر من حیث القوم کشمیری غیروں کو ہمیشہ غیر ہی سمجھتے رہے۔ جب کہ کئی بار مذہبی جذبات کا بھی استحصال کیا گیا۔

عرصہ دراز کے بعد مرزا علی اکبر خان نے ۱۰۱۲ھ میں نظامت صوبیداری کشمیر کا چارج سنبھالا۔ یہ بڑے ہی شریف، بہادر، سخی اور صاحب مروت مغل تھا۔ بدقسمتی سے اس کے عہد میں زبردست سیلاب آئے اور زراعت تباہ ہوئی۔ مگر علی اکبر خان نے لاہور سے غلہ منگوا کر قحط کا مقابلہ کیا۔ اس دور میں مغل اعظم بے حد کمزور ہوئے اور اکثر ان پر ضعف طاری رہتا تھا۔ اور آخر ۱۳ ماہ جمادی الثانی ۱۰۱۴ھ کو ان کا انتقال ہوا۔ اکبر اعظم ذہانت، متانت، سیاست، حکمت عملی کا ایک عظیم مجموعہ تھے۔ ان پڑھ ہونے کے باوجود شعر و سخن سے بے حد لگاؤ تھا۔ اور خود بھی شعر کہتے تھے۔ یہ رباعی ـــ

خوش آنکہ با خیال تو عمرے نشستہ بودم
در شوق سرو قدت از جائے جستہ بودم
عیبم مکن کہ گفتم موئے ترا پریشان
در شرح جعد زلفت چوں دل شکستہ بودم

اکبر اعظم کی طرف منسوب تھی۔ مگر بعد میں اکبر کے والد ہمایوں کی بیاض میں اسکو سرفہرست پایا گیا۔ بابر، ہمایوں اور اکبر تینوں کے متعلق مشہور ہے کہ برجستہ شعر کہتے تھے۔ بابر کا یہ شعر اب بھی دنیا کی مجالس میں گردان کا سبب بنتا ہے ؎

نوروز و نوبہار و مئے دلبرا خوش است
بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

اکبر اعظم کی وفات پر کشمیر میں کافی ماتم کیا گیا۔ شک و شبہ کی فضا کو دور کرنے کے لئے سرکاری

ہاادب

بطور سوگ منانے کا اعلان ہوا۔ نظامت صوبیداری سے جو گزٹ شایع ہوا۔ اس میں مرحوم بادشاہ کے صفات و حسنات کے تذکرہ میں ذاتی جائداد کی مد بھی وضاحت سے درج تھی شائید دولت کی فراوانی کا یہ تذکرہ غریب کشمیریوں کے دلوں پر دبدبہ اکبری کا رعب جمانے کیلئے ظاہر کیا گیا۔ تفصیل ذاتی جائداد یوں درج تھی۔

۱۔ لعل و جواہر بمقدار یک ہزار کروڑ۔

۲۔ سونے کی اشرفیاں دس کروڑ۔

۳۔ سرخ سونا کندن دس من پختہ۔

۴۔ چاندی سفید ستر من۔

۵۔ بلور رنگدار ساٹھ من پختہ۔

۶۔ سکے پانچ ہزار کروڑ۔

۷۔ طبیلہ کے گھوڑے بارہ ہزار۔

۸۔ ہاتھی چھ ہزار۔

۹۔ ہرن پانچ ہزار۔

۱۰۔ چیتے نوسو وغیرہ وغیرہ۔

مرزا علی اکبر نے کل تین سال آٹھ ماہ صوبہ داری کی۔ اسی اثنا میں شہزادہ سلیم نورالدین جہانگیر تخت نشین ہوئے۔ ان کے عہد تک کشمیر میں سلطنت مغلیہ کی جڑیں کافی مضبوط ہو چکی تھیں۔ تاہم جہانگیر نے کشمیر کی عملداری میں کافی احتیاط سے کام لیا۔ زیارتوں اور خانقاہوں سے متعلق عطائے جاگیرات کے کئی فرمان جاری کئے۔ حضرت محبوب العالم مخدوم شیخ حمزہ رحمۃ اللہ علیہ کے مرقد مبارک اور سجادہ نشینی کے تحفظ سے متعلق کئی فرمان جاری کئے تاکہ زیارت عالیہ کے وارثوں اور سجادہ نشینوں میں منافقات اور اختلافات کا خاتمہ ہو سکے مگر افسوس کہ بعد میں بے شمار جعلی اور نام نہاد دستاویز اسناد پیش کر کے غیر مستحق لوگ زیارت پر چھائے رہے۔ نواب محمد قلیچ خان کو اسی بنا پر سر نو گورنر مقرر کیا گیا۔ کہ یہ بے حد خوش اعتقاد اور پابند صوم وصلوٰۃ بزرگ تھے۔ انہوں نے ننده ریشیوں، قلندروں، علماء اور مشائخوں کی تعظیم و تکریم میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ اگرچہ اس عہد میں زلزلے اور سیلاب سے

کافی تباہی مچی۔ لیکن لوگ مطمئن رہے۔ اور ۱۰۱۵ھ سے ۱۰۱۹ھ تک کا زمانہ بے حد تابناک رہا۔

اس کے بعد ہاشم خان، صفدر خان، احمد بیگ خان، دلاور خان ارادت خان اور اعتقاد خان یکے بعد دیگرے ۱۰۳۲ھ تک اس بساط حکومت پر فائز رہے بلکہ جہانگیر کے انتقال تک ان ہی میں سے کچھ حضرات بار دیگر نظامت کشمیر کے عہدہ پر متعین رہے۔ چنانچہ ۲۸ ماہ صفر ۱۰۳۷ھ کو جب راجوری میں شہنشاہ جہانگیر وفات پائے گئے اس وقت بھی اعتقاد خان ہی کشمیر کے گورنر تھے۔ نظامت کشمیر کو سنبھالنے اور سنوارنے میں دراصل اکبر اعظم نے ذاتی قابلیت اور ہوشیاری سے کچھ اصول مقرر کئے تھے۔ ان ہی پر دوسرے مغل حکمران بھی قائم رہے۔ راسخ الاعتقاد، حلیم الطبع، سخن شناس اور دور اندیش طبائع کے منتظم کو ہی جنت نظیر کشمیر کی عملداری کے اہل سمجھا جاتا تھا۔ باغ لگانا، سیر گاہیں بنانا، لوگوں سے رابطہ قائم کرنا، درویشوں، فقیروں اور بزرگوں کے حلقۂ ارادت میں شامل ہونا، شکار کھیلنا، شہسواری کے جوہر دکھانا اور شعر و شاعری کی محفلیں قائم کرنا، ان کی عادات میں شامل تھا۔ اور یہ تمام صفات بہادروں اور جانبازوں سے میل کھاتی ہیں، اس لئے اہل کشمیر اپنے بہادرانہ اور جنگجویانہ ورثہ کو مغل عملداری میں متعارف کرانے میں کوئی دقت محسوس نہ کر سکے اسی لئے فسادات اور خانہ جنگی کی جو آگ ہندوستان کے کونے کونے میں پھیلتی رہی، کشمیر اس سے محفوظ رہا۔ جہانگیر اور شاہجہاں کی تخت نشینی پر کئی بار علم بغاوت بلند ہوا۔ اس موقعہ پر کشمیری اگر چاہتے تو مغلیہ نظامت سے آسانی کے ساتھ علیحدگی اختیار کرتے۔ مگر یہ ان گورنروں کی حکمت عملی اور ہر دلعزیزی کا ہی نتیجہ تھا کہ کشمیری جانباز مغلوں کے حسن انتظام اور رواداری کے معترف رہے۔ رعایا پروری اور انصاف گستری میں مسلم اور غیر مسلم کا کبھی امتیاز نہ رہا۔ اعتقاد خان کے آخری وقت میں کچھ خرابیاں نظام حکومت میں پیدا ہو گئی تھیں، ان کو شاہجہاں نے آن کی آن میں دور کیا۔

جہانگیر کے بعد شاہجہاں نے نظام سلطنت کو درست کرنے کے لئے کچھ تبدیلیاں موزوں سمجھیں، اہم تغیر و تبدل میں ایک تجربہ کار ایڈمنسٹریٹر خواجہ ابوالحسن کو کشمیر کی نظامت سپرد کی گئی تھی۔ لیکن یہ کافی ضعیف ہو چکے تھے۔ انہوں نے اپنے فرزند خواجہ احسن اللہ ظفر خان

کو اس عہدہ پر تعینات کرنے کی استدعا کی شہنشاہ نے اس کو قبول کر کے انہیں سہ ہزاری کا منصب عطا کیا۔ یوں تو مغلیہ عہد میں نظامت کشمیر کا جو سربراہ مقرر ہوا۔ ان میں سے قریب قریب ہر ایک نے موزوں طبیعت پائی تھی۔ شعر و شاعری ان کی افتاد طبع میں شامل تھی۔ اکبر، جہانگیر، ملکہ نور جہاں اور شاہ جہاں خود نہ صرف اچھے شعر موزوں کرتے تھے۔ بلکہ غضب کے سخن شناس بھی تھے۔ شاعروں اور عالموں کی قدر کرتے تھے۔ اس شاہانہ سرپرستی سے عہد مغلیہ میں شعر و شاعری ایک لازم ملزوم جز بن گئی تھی۔ ظفر خان نے کابل و دیگر علاقہ جات میں اپنی بے پناہ صلاحیتوں سے نام پیدا کیا تھا۔ لیکن ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کو اس وقت منظر عام پر آنے کا موقع ملا، جب وہ کشمیر کے گورنر مقرر ہوئے۔ اسی وجہ سے کشمیر کے عوام اور علم دوست حلقوں میں وہ کافی گھل مل گئے اور نام پیدا کیا۔ ان کا نام خواجہ احسن اللہ تربتی تھا، "ظفر خان" کا لقب انہیں پے در پے فتوحات پر ملا تھا۔ ان کے آباؤ اجداد ایران سے برصغیر آئے تھے۔ اصل میں یہ مشہد کے رہنے والے تھے۔ جہانگیر کے خلاف بایزید انصاری کے پوتے نے جو انقلابی تحریک "روشنائی" کے نام سے شروع کی تھی۔ اس کو ختم کرنے میں ظفر خان نے اچھی حکمت عملی اور بہادری کا مظاہرہ کیا اس پر جہانگیر بے حد مسرور ہوئے اور انہیں خلعت مزید عطا کیے۔

کشمیر کی صوبہ داری کا یہ زمانہ ظفر خان کی زندگی کا روشن دور تھا۔ اس دوران بے حد علم پروری، انتظامی صلاحیت اور فراخ دلی کی، انسانی قدروں کو روشن کیا۔ فوجی نقطہ نظر سے تبت خورد (بلتستان گلگت) کو فتح کیا۔ اس معرکہ میں ظفر خان کے ساتھ کشمیری جانبازوں نے بہادری کے جوہر دکھائے۔ ظفر خان کا دوسرا عوام پرور کارنامہ اہل کشمیر کو ناجائز محصولوں سے نجات دلانا تھا۔ صوبیدار اعتقاد خان نے جو ملکہ نور جہاں کا بھائی تھا کشمیر میں زعفران چننے اور لکڑی کاٹنے پر محصول لگا دیا تھا جس سے غریب لوگ بے حد پریشان اور کسی حد تک غیر یقینیت کی فضا قائم ہو چکی تھی۔ ایک کشمیری شاعر نے شاہ جہاں کی سالگرہ کے موقع پر زعفران کے اس محصول کی طرف چند شعروں میں کیا خوب اشارہ کیا تھا

خسروا، دانش پژوہا دادرا دین پرورا

اہل کشمیر اندر دیوان عدالت داد خواہ

زعفراں گویند خنداں سازد اندوہناک را
آمدند از زعفراں در گریہ جمعے بے گناہ

ظفر خان نے شہنشاہ جہانگیر سے ان محاصل کی معافی کا فرمان حاصل کیا۔ اور کشمیریوں کی دیرینہ شکایت دور ہوئی اس کے علاوہ اعتقاد خان کے عہد میں اور بہت سی زیادتیاں اور زبردستیاں رواج پا گئی تھیں فرمان کے ذریعہ ان کو بھی سختی سے روک دیا گیا۔ ایک اور رواج یہ تھا کہ صوبیدار فصل پکنے پر اچھے باغوں میں اپنے آدمیوں کے ذریعہ پھل حاصل کرتے تھے، ایسے حقوق مالکان باغات کو بھی حاصل نہ تھے۔ فرمان کے ذریعہ اس کو بھی رد کردیا گیا۔ فرمانِ شاہی کے آخر پر یہ بھی درج تھا کہ جو بھی اس کی خلاف ورزی کریگا اس پر خدا کی لعنت تو ہوگی ہی بادشاہ کا عتاب بھی نازل ہوگا۔ ظفر خان نے اس شاہی فرمان کو کندہ کرا کے جامع مسجد سری نگر کے جنوبی دروازے پر لگا دیا۔ جو اب بھی وہاں موجود ہے اور اس حقیقت کا اعلان کر رہا ہے کہ نہ صرف شہنشاہ اور اس کے صوبیدار ظفر خان کو عوام کی فلاح و بہبود اور انصاف کا کتنا خیال تھا۔ اور وہ ناانصافیوں کا ازالہ کرنے کے لئے "نقش بر سنگ" احکام جاری کرتے تھے۔ شاہ جہاں اپنے دور حکومت میں چار مرتبہ کشمیر آیا۔ ان میں سے دو مرتبہ ظفر خان کی صوبیداری کا زمانہ تھا۔ اکثر علماء، فضلا کو اعزاز دیئے گئے اور جاگیریں عطا کی گئیں۔ اہربل کے خوبصورت آبشار کو دیکھنے کے دوران ظفر خان نے شاہ جہاں کو اپنی مثنوی "ہفت منزل" پیش کی۔ یہ مثنوی کشمیر کے حسن خداداد کی تعریف میں لکھی گئی ہے مندرجہ ذیل دو شعروں سے کشمیر سے اس کے دلی لگاؤ کا اظہار ہوتا ہے۔

الٰہی تا بود کشمیر آباد
ز گلزار خراسانم مدہ یاد
بہر کس ہر چہ خواہد بے سخن دہ
مرا کشمیر و بلبل را چمن دہ

ظفر خان کے عہد صوبیداری میں ہی حضرت خواجہ خاوند محمود نقشبندی بخارا سے کشمیر تشریف لائے اور سلسلہ عالیہ نقشبندیہ کے طریقہ کو فروغ دیا۔ اسی دور میں خواجہ بازار سری نگر میں مشہور خانقاہ نقشبندیہ کی تعمیر شروع ہوئی۔ یہ خانقاہ فیض پناہ

حضرت خواجہ نے نبی اکرم صلعم کے جلوہ گر ہونے کے بعد ان ہی نشانات پر سر شروع کی جس کی نشاندہی آنحضور صلعم نے اپنے دستِ مبارک سے کی تھی۔ صوفیائے کشامرہ کا یہ عقیدہ ہے کہ قطب زماں اور قطب الاقطاب سال میں ایک دو بار اس خانقاہ فیض پناہ میں آتے ہیں۔ اور "ختم خواجگان" میں شامل ہوتے ہیں۔ اس کا تذکرہ بزرگان سلسلہ نقشبندیہ اپنی تصانیف میں کر چکے ہیں۔ خواجہ احسن اللہ ظفر خان کی خوش بختی تھی کہ یہ فیض عام تعمیر اور سلسلہ عالیہ نقشبندیہ کی ابتدا ان ہی کے عہد صوبیداری میں ہوئی۔ ان ہی کی استدعا پر خواجہ خاوند محمود نے اپنے فرزند دلبند خواجہ معین الدین ہادی کو سلسلہ نقشبندیہ کی ترویج کے لئے کشمیر میں رکھا۔ ان کا مرقد زیارت نقشبند صاحب کے نام سے وادی میں مشہور و معروف ہے۔ خواجہ خاوند محمود نے ۱۱ ماہ شعبان سنہ ۱۰۵۱ھ کو لاہور میں رحلت کی۔ ان کی تاریخ وفات احسن اللہ خان ظفر نے ہی موزوں کی ہے۔

سال تاریخ رحلتش ہاتف

بود وے صاحب فضائل گفت

ظفر خان احسن با صلاحیت صوبیدار اور سپاہی ہونے کے علاوہ بہترین منتظم بھی تھا۔ اس کے اشعار میں بلا کا سوز اور درد تھا۔ گل گشت چمن پر یہ فریفتہ تھا مرزا صائب کی شاگردی پر اس کو فخر تھا۔ اس کا تذکرہ اس طرح کیا ہے۔

طرز یاراں پیش احسن بعد از یں مقبول نیست

تازہ گوئی ہائے او از فیض طبع صائب است

مثنوی "ہفت منزل" کے علاوہ "جلوۂ ناز" اور "میخانۂ راز" کے نام سے اس کے دو دیوان مشہور ہیں۔ اس علم پرور صوبیدار کشمیر کے ذوق سخن طرازی کا ان اشعار سے بھی کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

دید زلف تو مگر بے سر و سامانی ما

کہ چنیں گشت پریشاں ز پریشانی ما

گوشۂ چشم اگر ساقی بما دارد بجاست

عمر ہا در گوشۂ میخانہ خدمت کردہ ام

یہ رباعی بھی کیا خوب ہے۔

استاد مرا چو درس بے نوشی گفت
اول سبقم حدیث بے ہوشی گفت
تا خاطر عالمی پریشاں گردد
احوال دلم، زلف بسر گوشی گفت

خود صائب ظفر کی تعریف میں گویا ہے:

خان خاناں را بہ بزم و رزم صائب دیدہ ام
در سخا و در شجاعت چوں ظفر خان تو نیست

ظفر خان احسن کے بعد مغلوں کا کوئی ایسا صوبیدار کشمیر میں نہیں آیا، جس نے اپنی علم دوستی، معارف پروری سے عوام کے دلوں کو جیتا ہوا۔

خمور حسین بدخشی

کلامِ داغ میں تصوّرِ محبوب

محبوب یوں تو ہر کوئی حسین ہوتا ہی ہے۔ لیکن اگر خوبصورتی کا معیار محبوب کا دہن نہ ہونا اور کمر کا موہوم ہونا ہی ہے تو داغ کے محبوب میں یہ صفات نہیں ہیں۔ لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ ان صفات کے نہ ہوتے ہوئے بھی ہم اسے دیکھ کر خدا کی قدرت کی داد دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

تری صورت کو دیکھتا ہوں میں
اس کی قدرت کو دیکھتا ہوں میں

★

پوچھتے کیا ہو یہ کیا ہے یہ کتابی چہرہ
پہلے میں ہاتھ میں قرآن اٹھاؤں تو کہوں

★

یہ ناز، یہ نگاہ، یہ چھل بل، یہ شوخیاں
تم اس سے بھی سوا ہو قیامت سے کم نہیں

★

ٹھہر گئے وہ جہاں سرو باغ تھے گویا
اگر چلے تو نسیم بہار ہو کے چلے

★

ہر ادا مستانہ سر سے پاؤں تک چھائی ہوئی
اُف تری کافر جوانی جوش پہ آئی ہوئی

اب اس کافر جوانی کی اداؤں کا بھی شمار کرتے جائیے اور دیکھئے ادا سے ادا اور آن سے آن کیا نکلتی ہے۔

دلبری بھی ادائیں بھی دلکش ہیں جفائیں بھی
اک آن ستم گر میں ہر آن نکلتی ہے

★

سادگی، بانکپن، اغماض، شرارت، شوخی
تو نے انداز وہ پائے ہیں کہ جی جانتا ہے

★

بھر دیں عجیب ادائیں اس شوخ سیم تن میں
اک ٹیڑھ سادگی میں اک سیدھ بانکپن میں

★

تغافل میں شوخی نرالی ادا تھی
غضب تھا وہ منہ پھیر کر دیکھ لینا

اب سنئے اس کافر ادا کی باتیں بھی اور باتوں سے رنگ طبیعت کا اندازہ بھی کرتے جائیے۔

یہ کیا کہا کہ "میری بلا بھی نہ آئیگی"
کیا تم نہ آؤ گے تو قیامت بھی نہ آئیگی

★

سُن سُن کے میری شوخیٔ تقریر یوں کہا
"توبہ ہے یہ زبان بھی رہے گی دہن میں گیا"

★

میری التجا پر بگڑ کر وہ بولے
"نہیں مانتے اس میں کیا ہے کسی کا"

یاد ہے کہنا وہ کسی وقت کا
"نہیں مانتے اس میں کیا ہے کسی کا"

★

خط مرا پھینک دیا یہ کہہ کر
"ہم سے دفتر نہیں دیکھا جاتا"

طبیعت کے اس رنگ میں طنز اور شوخی کا یہ امتزاج بھی ملاحظہ فرمائیے

غضب ہے جن پہ دل آئے کہیں انجان بن کر وہ
"کہاں آیا کدھر آیا وہ کیوں آیا یہ کب آیا"

★

یہ کہہ کر کیا اس نے شرمندہ مجھ کو
"سلامت رہیں بے وفا کہنے والے"

★

سن کے وہ حال میرا غصے سے فرماتے ہیں
"آئے ہیں آپ محبت کا سند یہ لے کر"

محبوب کے اس تصور میں ایک اور بات قابلِ ذکر یہ ہے کہ جاگیرداری ماحول میں اٹھنے بیٹھنے کے باوجود اس کے حسن و رعنائی، شوخی و طنز اور اندازِ تکلم میں وہ شان پائی جاتی ہے جو اسے جاگیرداری ماحول کے اس محبوب سے علیحدہ کر دیتی ہے جو بے وقت کے غمزہ ادا اور فحش اندازِ تکلم کو ہی انداز محبوبانہ تصور کرتا ہے۔ داغ کے محبوب کو درست نزاکتوں کا احساس ہے۔ اس کی درست تعلیم و تربیت ہوئی ہے اور یہ اس درست تعلیم و تربیت کا نتیجہ ہے کہ اسے بات کرنے اور بات سمجھنے کا انداز آتا ہے۔

ترستے ہیں قیامت کو غضب کے رات دن فقرے
نئی جب بات نکلے گی تری محفل سے نکلے گی

★

شوخی میں تمکنت ہے تو ہے ناز میں نیاز
تعلیم تم نے پائی ہے اچھے ادیب سے

★

لوٹ لیتی ہے داغ کے دل کو
تری ہر ایک پیاری بات

آیئے اب اس مستانہ اداؤں اور پیاری پیاری باتیں کرنے والے محبوب کے ایک اور رُخ پر بھی نظر ڈالتے جائیں۔

لڑتی جاتی ہے غیر سے بھی آنکھ
مجھ سے بھی بات کرتے جاتے ہیں

★

الٰہی کیوں نہیں اٹھتی قیامت ماجرا کیا ہے
ہمارے سامنے پہلو میں وہ دشمن کے بیٹھے ہیں

★

چاہنے والے بُرے ہوں کہ بھلے
ان کے دفتر میں نام ہے سب کا

تصویر کا یہ رُخ یقیناً "مستحسن" قرار نہیں دیا جاسکتا جہاں سینکڑوں طالب دیدار چلے آتے ہوں اور جہاں داغ ایک طرف شاگردوں کا رجسٹر کھول رہے ہوں اور دوسری جانب محبوب عاشقوں کا ــــ لیکن اسے کیا کہیے کہ جاگیردارانہ نظام میں زندگی اور اخلاق کے تقاضے ہی کچھ اور تھے۔ اس میں طوائف کو اس نظرت بالکل نہیں دیکھا جاتا تھا، جس نظر سے آج اسے دیکھا جاتا ہے۔ یہ نہ صرف امارت اور شان و شوکت کا ایک ضروری جزو تصور کی جاتی تھی، بلکہ جس رئیس اور نواب کے پاس زیادہ سے زیادہ طوائفیں ہوتیں وہی رئیس بھی تھا اور نواب بھی۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے نظام میں رہ کر اس عورت کو اپنی زندگی کے متعلق وہ احساس نہیں ہوتا تھا جو کہ اسے ہونا چاہیے تھا، یا جو اسے آج کے ماحول میں رہ کر ہو جاتا۔ دراصل جاگیردارانہ ماحول میں عورت کا تصور ہی بہت عجیب

وغریب تھا۔ ایک طرف زر و زیور اور کبھی کبھی بے لوث اور بے غرض محبت سے طوائف کی حوصلہ افزائی کی جاتی تھی اور دوسری طرف ازدواجی زندگی کی عورت کو ایک لونڈی یا فرمانبردار کنیز سے زیادہ کچھ اور خیال نہ کیا جاتا تھا۔ اس سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ چار پہر پردے میں رہے اور اپنے جذبات، خیالات و احساسات کو بہر صورت دبائے رکھے۔ اس سے محبت کرنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ اور ایسا کرنا خلاف عقل، خلاف دل اور شاید خلاف تہذیب و تمدن تصور کیا جاتا تھا۔ یہاں یہ بیان کرنا بھی ضروری ہے کہ تعلیم و تربیت اور تہذیب و شائستگی کے اکثر تقاضے بھی طوائفوں سے ہی وابستہ سمجھے جاتے تھے۔ ہماری شاعری میں امرد اور محبوب کی خیالی تصویر کو چھوڑ کر بالعموم محبوب کا تصور طوائف کے ہی روپ میں ملتا ہے۔ محبوب کا یہی تصور داغ کے ہاں بھی ہے۔ اس میں بھی روایتی محبوب کی طرح آئینہ کی سی پریشان نظری اور طوطا چشمی پائی جاتی ہے۔ اس کا کام بھی جور و جفا اور قتل عام ہے۔ لیکن اس میں اور روایتی محبوب میں فرق یہ ہے کہ اگر یہ جور و جفا بھی کرتا ہے تو مہر و وفا میں بھی پیچھے نہیں رہتا۔ یہ شوخ ضرور ہے مگر اس کی شوخی میں متانت بھی پائی جاتی ہے۔ اسے بات سمجھنے اور بات کرنے کا بھی بڑا خوشگوار سلیقہ ہے۔ شعر فہمی بھی ایک خوبی ہے۔

شکر خدا کہ عشق نے کچھ کچھ اثر کیا
وہ دیکھتے ہیں داغ کا دیواں کبھی کبھی

یہی عورت ہے جو داغ کی غزل میں نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔ اس کی ساری عمارت اسی موضوع کے سہارے کھڑی ہوتی ہے۔ باقی جتنے بھی موضوعات ملتے ہیں، ان کی حیثیت ضمنی اور فروعی ہے۔ لیکن عورت کی حیثیت بنیادی ہے۔ یہ عورت داغ کے یہاں ایک کیف پیدا کرتی ہے۔ سرخوشی کا ایک ماحول اسی کے دم سے وجود میں آتا ہے۔ تعیش اور لذتیت کے تمام سامان اسی کے توسط سے فراہم ہوتے ہیں۔ اور ایک ایسا ماحول پیدا ہو جاتا ہے کہ دنیا و مافیہا کی خبر نہیں رہتی۔ اور پھر بات یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ اس کی وجہ سے ہنگامے بھی برپا ہوتے ہیں۔ وہ انسان کو گھائل بھی کرتی ہے۔ کاری زخم بھی لگاتی ہے۔ چھیڑ چھاڑ بھی ہوتی ہے۔ بوس و کنار سے بھی لطف اٹھایا جاتا ہے۔ دھول دھپا بھی ہوتا

ہے اور پیش دستی بھی ـــ بے شک داغ نے عورت کے بارے میں ان تمام باتوں کو پیش
کر کے کوئی نئی بات نہیں کی ہے۔ کیوں کہ اردو شاعری میں اس کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں۔
لیکن اس کے باوجود داغ نے اس میں اپنی انفرادیت کو برقرار رکھا۔ ان کی مخصوص ذہنی کیفیت
جو ایک مخصوص ماحول میں پرورش پانے کے باعث ان کے یہاں پیدا ہوتی تھی۔ــــ
سے زیادہ کام کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

داغ کے یہاں عورت ایک لذت اور تعیش کا ذریعہ ہے۔ اس کی ایک
سماجی حیثیت بھی ہے۔ وہ ایک آلۂ کار ہے چند مخصوص افراد کو خوش رکھنے کا۔ یہ عورت
کا کوئی بلند تصور قرار نہیں دیا جائے گا۔ اس میں بازاری انداز ہے۔ اور اس میں شک نہیں
کہ داغ کی غزلوں میں مجموعی طور پر عورت کا جو تصور موجود ہے وہ بازاری ہے۔ داغ نے
اگرچہ جگہ جگہ کسی عورت کو محبوب کے نام سے یاد کیا ہے اور ساری باتیں اسی محبوب کو محور
بنا کر کہی ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ داغ نے اپنی غزل میں محبوب کے جس تصور کو سمویا
ہے وہ عورت کا روائتی تصور نہیں ہے۔ داغ نے بازاری عورت کو محبوب کہا ہے
اور یہ عورت ان کی محبوب ہے بھی۔ کیوں کہ یہی وہ عورت ہے جس کے ذریعے سے
تعیش اور لذت کا ماحول پیدا ہوا ہے۔ یہی تہذیب بھی سکھاتی ہے اور تہذیبی فضا
بھی پیدا کرتی ہے۔ امرا و روسا کی نام نہاد امارت و ریاست کا راز اسی سے وابستگی
میں مضمر ہے۔ آخر غم غلط کرنے، اپنی عظمت کا سکہ بٹھانے، اپنے آپ کو منظر عام پر لانے
اپنی ہستی کو فریب دینے کا کوئی ذریعہ تو ہونا ہی چاہیئے۔ یہ عورت زندگی کے ایسے لمحات
میں ہمیشہ آڑے آرہی ہے۔

محبوب کی شخصیت اور کردار داغ کی شاعری میں بہت نمایاں ہے
لیکن اس کی حیثیت بازاری ہے۔ اس کی چال ڈھال، اس کے طور و طریق، اس کے
عادات و اطوار، اس کے معیار، اس کی قدریں، سب میں وہی خصوصیات ہیں جو عام طور پر
ایسی عورت میں پائی جاتی ہیں جسے سماجی زندگی میں کوئی اعلیٰ حیثیت حاصل نہیں ہوتی۔ داغ
نے ہر چند اپنے اسلوب میں روائتی تصور کا رنگ بھرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن اس کے
باوجود اس کے اصلی خد و خال نمایاں ہو جاتے ہیں۔ داغ کی بڑائی اس میں ہے کہ انہوں نے

اپنے محبوب کو اس حقیقت کے باوجود کہ وہ بازاری طبقے سے تعلق رکھتا ہے، ایک انسان اور ایک عورت کی طرح پیش کیا ہے۔ اس میں وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جو صنف لطیف کی ذات کا بنیادی جز ہیں۔ داغ کا یہ محبوب بہت بے تاب ہے، بڑا شوخ ہے، بڑا تیز، بڑا طرار ہے اور بڑا حاضر جواب ہے۔ اس میں وہ تمام خصوصیات بھی ہیں، جن کا فطری طور پر صنف لطیف میں پایا جانا ضروری ہے۔ چنانچہ اس بے باکی، شوخی، تیزی، طراری اور حاضر جوابی کے باوجود اس میں ایک فطری شرم و حیا کی کیفیت بھی موجود ہے جو اس کی نسائیت پر دلالت کرتی ہے۔ وہ اگرچہ کھل کھیلنے اور داد عیش دینے میں جھجکتا نہیں لیکن اس سلسلے میں کوئی اقدام بھی نہیں کرتا۔ بلکہ کسی کی دراز دستی کا انتظار کرتا ہے۔ یہ بات بھی عورت کی فطرت میں داخل ہی سمجھ لیجئے۔ اس لئے داغ نے محبوب کا جو تصور پیش کیا ہے، وہ اگرچہ بلند نہیں ہے لیکن صحت مند ضرور ہے۔ اس میں برتری کی خصوصیت نہیں ہے۔ لیکن وہ زندگی میں مطابقت ضرور رکھتا ہے۔ اس میں رفعت نہیں ہے لیکن وہ انسانی نفسیات کے ساتھ ہم آہنگ ضرور ہے۔ داغ نے اس حسن کا جو تذکرہ کیا ہے۔ اس کے کردار کی جو تصویریں پیش کی ہیں۔ ان سب میں یہ بنیادی خصوصیت صاف جھلکتی ہے۔ چند اشعار سے اس کا اندازہ بخوبی ہو گا۔

یہ ناز، یہ نگاہ، یہ چھل بل، یہ شوخیاں
تم اس سے بھی سوا ہو قیامت سے کم نہیں

•

شرم سے آنکھ ملاتے نہیں دیکھا ان کو
پار ہوتی ہیں کلیجے کے نگاہیں کیوں کر

•

وہ شرماتی ہوئی آنکھیں، وہ گھبراتی ہوئی باتیں
نکل کر گھر سے گھرنا ترا امیدواروں میں

•

یہ جو ہے حکم میرے پاس نہ آئے کوئی
اس لئے روٹھ رہے ہیں کہ منائے کوئی

ان اشعار سے یہ حقیقت کسی قدر واضح ہو جاتی ہے کہ داغ کا محبوب حسن و شباب کا پتلا ہے۔ اور وہ اسی حسن و شباب کی وجہ سے اس کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ محبوب کو خود اپنے حسن و شباب کا احساس ہے۔ اور وہ اس حسن و شباب اور اس کے تعلقات کو نمایاں کرنے سے باز نہیں آتا۔ وہ حسن و شباب میں ناز و ادا کا رنگ بھرتا ہے، شوخیوں کو زیور بناتا ہے۔ اور اس طرح لوگوں کے دلوں میں گھر کر لیتا ہے۔ اور پھر وہ تمام واقعات ظہور پذیر ہوتے ہیں جو غزل کی روایات میں داخل ہیں۔ اور جس کو داغ نے بھی پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ داغ کا محبوب ان تمام روایات کا علمبردار ہے۔ اس میں ایک روایتی محبوب کی تمام خصوصیتیں موجود ہیں۔ لیکن انہوں نے اس کی شخصیت اور کردار کو حقیقت اور واقعیت سے زیادہ قریب کیا ہے۔ اس طرح اس میں انسانی خصوصیات کو نمایاں کرنے میں وہ پوری طرح کامیاب ہوئے ہیں۔

سیف الدین سوز

مولانا عبد الغفار تائب ــ ایک تعارف

مولانا عبد الغفار تائب کشمیر کے ایک باکمال نعت گو شاعر کا نام ہے جو ۱۸۲۵ء کے قریب موضع ہٹن میں تولد ہوئے۔ یہ امر بے حد افسوسناک ہے کہ تائب جیسا عظیم شاعر ابھی تک گمنام رہا۔ اس کی وجہ ہماری نظر کی نارسائی ہے۔ ورنہ تائب نے نہ صرف کشمیری میں ایسی نعتیں لکھی ہیں کہ ان کو جامی کا ہم پلہ قرار دیا جاتا ہے بلکہ فارسی میں بھی ایسی نعتیں لکھی ہیں کہ جامی بھی ان پر رشک کرے۔

عبد الغفار تائب کے والد کا نام مولوی غلام رسول تھا جو دینی تعلیم کے مدرس تھے۔ مولوی غلام رسول نے عبد الغفار کی صلاحیتوں کا اندازہ کرتے ہوئے عبد الغفار کو سری نگر میں ایک اعلیٰ علمی ماحول میں تربیت کے لئے پہنچایا۔ اس زمانے میں سرینگر میں کچھ جید علماء کے ہاں درس و تدریس کا مناسب انتظام تھا اور دینیات کے صاحب ذوق بھی انہی درسگاہوں سے فیضیاب ہوتے تھے۔ مولوی غلام رسول نے عبد الغفار کو نہایت چھوٹی عمر میں سید حسین منطقی صاحب کے پاس تعلیم و تربیت کے لئے رکھا جو عالی کدل میں راہ بابا صاحب کی زیارت کے متصل رہتے تھے۔ سید حسین منطقی کے ہاں اعلیٰ درجے کا علمی، مذہبی اور ادبی ماحول تھا۔

عبد الغفار بے حد ذہین تھا اور علم و ادب کے لئے فطری تڑپ رکھتا

تھا اس وجہ سے اس نے فقہ اور علم قرآن و حدیث میں اعلیٰ مہارت بہت جلد طے کئے اور علم تصوف سے بھی بہرہ مند ہوا۔ اس کے بعد وہ اوائل عمر میں ہی علمائے فضلا کی صف میں شامل ہو گیا۔ سید حسین منطقی کے ہاں اُس وقت کے علماء و فضلاء اکثر جمع ہوتے تھے۔ اس ماحول میں عبدالغفار کی ادبی و علمی صلاحیتیں ابھر آئیں۔ یہیں عبدالغفار نے فنِ سخن شروع کی اور تائب تخلص کیا۔

تلاش بسیار کے بعد بھی یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ سید حسین منطقی کے مکتب سے کب فارغ التحصیل ہوئے۔ البتہ یہ ایک طے شدہ حقیقت ہے کہ تائب کم عمری میں حسین صاحب کے مکتب سے فارغ التحصیل ہو کر پٹن آئے اور پٹن اور اس کے گرد و نواح میں ایک عالم و فاضل کی حیثیت سے پہچانے جانے لگے۔

مولانا عبدالغفار تائب دینی مواعظ کے لئے دوروں پر جاتے رہے مگر بہت جلد وہ ایک اعلیٰ مرتبہ کے نعت گو و منقبت گو شاعر کی حیثیت میں مشہور ہو گئے۔ رفتہ رفتہ ان کی لکھی ہوئی نعتوں اور منقبتوں کو کشمیر بھر میں قبول عام حاصل ہوا۔ چونکہ اُن کو لحنِ داؤدی بھی عطا ہوا تھا اور نعت و منقبت ایک خاص دلنشین انداز میں پڑھتے تھے اس لئے اطراف و اکناف سے ان کو خصوصی طور مدعو کیا جانے لگا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تائب صاحب کا سری نگر کے ساتھ تعلق کم ہوتا گیا۔ اب وہ سری نگر بہت کم جاتے تھے۔ تاہم اُن کو عمر بھر سید حسین صاحب منطقی کا احسان یاد رہا جن کے آگے زانوئے ادب تہہ کر کے انہوں نے علم و ادب کا وہ فیضان حاصل کیا تھا جس نے مولانا تائب کو نصف صدی سے زیادہ عرصہ کے لئے شمع محفل بنا دیا تھا۔ اس احسان کا احساس تائب مرحوم کو اپنی آخری عمر تک رہا۔ چنانچہ ایک طویل منقبت کے آخری بند میں یوں گویا ہیں۔ ؎

مرا سید حسینی منطقی بود
ادیب اندر دلبستان محبت
بجوری خوردم از آو آب و تابے
کہ بود اندر ستارم تران ہیبت

جن دنوں مولانا عبدالغفار تائب کی شہرت ضلع بارہ مولہ میں پہونچی بارہ مولہ میں خواجہ عزیز ککرو المعروف عزہ بابا کی علم دوستی اور عالم نوازی کا شہرہ چاردانگ عالم میں چھایا ہوا تھا۔ خواجہ عزہ بابا اور ان کے برادر خواجہ علی ککرو معروف رؤسائے کشمیر سے تھے خواجہ عزہ بابا جاگیردار تھے۔ جنگلات اور ریشم کے ٹھیکے بھی انہی کے پاس تھے۔ ان کے کاروباری تعلقات زیادہ تر پنجاب کے ساتھ تھے۔ وہ خود عالم و فاضل تھے اور علم دوستی و ادب نوازی میں اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے۔ ان کے برادر خواجہ علی ککرو بھی اپنے برادر اکبر کی طرح علم دوست تھے۔ خواجہ عزہ بابا اسلامی روایات و علامات کا تحفظ کرنے میں بڑی دلچسپی رکھتے تھے اور اولیائے کرام کے ساتھ والہانہ عقیدت رکھتے تھے۔ وہ اکثر لاہور جاتے اور وہاں کی دینی علمی و ادبی محفلوں میں شمولیت کرتے۔ لاہور کی تمدنی زندگی پر خواجہ صاحب نے جو تاثرات مرتب کئے ان کے نشانات ابھی تک موجود ہیں۔ لاہور میں مساجد اور خانقاہوں کی تعمیر کے لئے خواجہ عزہ بابا دل کھول کر اعانت کرتے رہے۔ اس کے علاوہ لاہور میں شاہ محمد غوث کی زیارت اور مسجد کی تعمیر بھی انہوں نے اپنے صرفہ سے کرائی۔ اس مسجد و خانقاہ کی مالی حالت بہتر بنانے کے لئے دکانیں تعمیر کرائیں اور مسافروں کے ٹھہرنے کے لئے ایک علیحدہ مکان تیار کرایا۔ خواجہ عزہ بابا نے کشمیر میں بھی کئی مساجد تعمیر کیں اور کئی خانقاہوں کی تعمیر و مرمت کا انتظام کیا جن میں سوپور کی خانقاہ حضرت امیر کبیر اور مزار شریف حضرت [illegible] شیخ الاسلام شامل ہیں۔

خواجہ عزہ بابا مرحوم کے ہاں ایک [illegible] دیوان خانے میں، جو خستہ حالت میں اب بھی موجود ہے، اکثر ادبی اور علمی محفلیں منعقد ہوتی تھیں۔ تائب مرحوم بہت خوش نصیب تھے، ان کا علم و ادب کے مربی خواجہ عزہ بابا سے تعارف ہوا۔ ان کے جوہر کو تیز بین جوہری نے پہچانا۔ ایسا ہوا کہ رہ نوردِ شوق کو منزل مل گئی۔

تائب مرحوم کو پیغمبر اسلام سے بے پناہ عشق تھا اور اولیائے کرام سے بھی بے حد عقیدت تھی اور اسی لئے ان کی [illegible] نعتوں اور مناقب میں وجد آفرینی [illegible] پایا جاتا ہے [illegible] معروف شاعر [illegible] ان اور شاہ [illegible]

کہ آخری وقت تک اُن کو خدمت کرتے رہے۔ خواجہ عبدالصمد ککروؔ صاحب مرحوم کی مستقل صحبت سے نہ صرف علم و فضل سے فیضیاب ہو گئے۔ بلکہ فیضیاتِ صحبت کے نتیجے میں سخنور بن گئے اور مقبلؔ تخلص کیا۔ صاحب مرحوم نے اس ہونہار شاگرد کی شعر گوئی میں تربیت کی۔ اکثر مقبلؔ کو خطوط بھی شعر ہی میں لکھتے۔ مقبلؔ کے نام ایک منظوم خط کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے۔ ؎

بامدادِ جنابِ شاہِ بغداد
مسرت سبز و رخت سرخ و دولت شاد
زشاگرد عزیزم در تعجب
چرا یادش نیامد حقِ استاد
بروزِ کتخدائی خواجہ صاحب
بیادش ماند یادش خانہ آباد
شود مرگ حفیظ اللہ فراموش
چہ می آید مرا زیں بے ادب یاد
پس از دیگر برائے ہو نیز اشتی
جبانے را بہ پیشِ من فرستاد

افسوس کہ ہمارے زمانہ میں استاد و شاگردی کی مراسلت باقی نہیں رہ سکی ہے۔ خواجہ عبدالصمد ککروؔ مقبلؔ کے لئے شعر گوئی بہت سے مشاغل میں شامل تھی۔ وہ جاگیردار تھے اور وقت کی سرکاری انتظامیہ سے ان کے تربیاً مراسم تھے، وسیع تجارت کے سلسلے میں ریاست سے باہر جاتے تھے اُس زمانے میں عوام کے باہمی جھگڑوں کو عام طور پر عدالتوں سے باہر ہی طے کیا جاتا تھا۔ خواجہ مقبلؔ یہ فریضہ بھی انجام دیتے۔ پھر دینی و علمی مجالس کا انعقاد اور دوسرے امور

اِن مشاغل کے درمیان مقبلؔ مستقل طور شاعری کے نازک فن سے وابستہ نہ رہ سکے۔ مگر وہ شاعر تھے۔ اور اُن کی شعری صلاحیتوں کو دور دور تک علمی حلقوں میں تسلیم کیا گیا تھا۔ چنانچہ لاہور کے علمی حلقوں میں بھی مقبلؔ کو پہچانا جاتا تھا

اصطلاح میں خوش اعتقاد تھے یعنی اولیائے کرام کے تئیں والہانہ عقیدت رکھتے تھے۔ اس لئے نائب صاحب کو یہاں کا ماحول پسند آیا اور بس یہیں کے ہو رہے۔ متذکرہ دو خاندان مخدوم نیار زنگامیوں کے مجاور بھی رہتے تھے۔ خواجہ عظیم بابا جانپورہ میں حضرت سید محمد جانباز رفاعی کی درگاہ کا مجاور و متولی تھا اور خواجہ عزہ بابا اور خواجہ علی ککرو بارہ مولہ میں آثار زیارت کے مجاور تھے جس کی نسبت آنحضور صلعم سے کی جاتی ہے۔ یہاں بھی موئے مبارک رسول اللہ صلعم زیارت کے لئے رکھے گئے ہیں اور اس موئے مبارک کی سند کو اتنا ہی معتبر خیال کیا جاتا ہے۔ جتنا سرینگر میں حضرت بل کے موئے پاک کو۔

خواجہ علی ککرو زیارت سید محمد جانباز رفاعی کے مخلص عقیدت مند تھے اسی عقیدت مندی کے نتیجے میں خواجہ علی ککرو کے ہاتھوں سید محمد جانباز رفاعی کا روضہ ۱۲۹۲ھ میں سرِنو تعمیر ہوا۔ روضے کے باہر دہلیز کے اوپر نائب صاحب کے یہ اشعار جلی حروف میں اب بھی موجود ہیں جن میں زیارت کی موجودہ تعمیر کا تذکرہ ہے۔

شکر للہ شدہ معمور بگفتا نائب
کعبۂ اہلِ صفا روضۂ جانباز ولی
یافت اسرار ز سر شہ مردان دل گفت
بانیِ مرقدِ جانباز ولی خواجہ علی!

بارہ مولہ کے اکابرین نے مولانا عبدالغفار نائب کو درس و تدریس جاری رکھنے پر آمادہ کیا۔ یہ فریضہ نائب صاحب نے جانپورہ بارہ مولہ میں شروع کیا۔ یہیں مولانا نائب کے علم و فضل سے متاثر ہوکر خواجہ عظیم بابا نے اپنی دختر کو مولانا کے عقد میں دیدیا۔ خواجہ عظیم بابا کے فرزند خواجہ علی شاہ نے مولانا نائب کی ہر طرح سے دلجوئی کی۔ اس طرح جانپورہ میں ایک ایسی درسگاہ قائم ہوئی جس نے اپنے وقت کے جید علماء پیدا کئے۔ نائب صاحب کے شاگردوں کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ دور دراز جگہوں سے طلباء ان کی درسگاہ میں شامل ہو گئے۔ نائب صاحب کے شاگردوں میں خواجہ عبدالصمد ککرو مقبول کا تذکرہ تفصیل کا متقاضی ہے۔ کیونکہ خواجہ صمد ککرو مقبول۔ آپ کے سب سے زیادہ فرمانبردار شاگرد تھے اور نائب مرحوم

وہ علّامہ اقبالؔ مرحوم سے قریبی طور متعارف تھے۔ چنانچہ جب مقبولؔ مرحوم کے سب سے بڑے فرزند غلام نبی کرو جوان مرگ ہوگئے تو علّامہ اقبالؔ مرحوم نے مقبولؔ کے نام تعزیت نامہ ارسال کیا اور گہرے رنج و ملال کا اظہار کیا۔

مولانا عبد الغفار تائبؔ کا پیشہ درس و تدریس تھا۔ مگر شعر گوئی اُن کی زندگی تھی۔ تائبؔ مرحوم نے ۹۰ برس کی عمر پائی اور آخری عمر تک شعر کہتے رہے۔ تائبؔ کو تین زبانوں۔ عربیؔ، فارسی اور کشمیری پر عالمانہ عبور اور شاعرانہ دسترس حاصل تھی۔ وہ تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے اور فی البدیہہ شعر کہنے میں اُن کو زبردست ملکہ حاصل تھا اُن کے کلام میں اعلیٰ درجہ کی فصاحت و بلاغت ملتی ہے۔ آج بھی مولانا تائبؔ کو جاننے والے کچھ لوگ بقید حیات ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ اُنہوں نے تائبؔ مرحوم کے بعد کوئی قابل قدر صاحب فصاحت و بلاغت عالم و شاعر نہیں دیکھا ہے۔

تائبؔ مرحوم نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی مگر اُن کے ماحول پر مذہب کی گہری چھاپ تھی اس لئے اُن کے نعتیہ اور منقبتیہ کلام کی ہی حفاظت ہوسکی ہے۔ بہر حال زمانہ کی دست اندازیوں سے اُن کا کلام محفوظ رہا ہے۔ اُس کے پیش نظر یہی کہا جاسکتا ہے کہ تائبؔ مرحوم بنیادی طور پر ایک نعت گو شاعر ہیں۔ میرا خیال ہے کہ کشمیر کے نعت گو شعراء میں مولانا تائبؔ کا مقام بہت بلند ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ اُن کے کلام میں ایک خاص قسم کا درد و گداز پایا جاتا ہے جس کی نظیر نہیں ملتی۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ تائبؔ مرحوم صرف شاعر نہ تھے۔ وہ عربی اور فارسی کے جید عالم بھی تھے اور لوازمات فن سے کما حقہٗ بہرہ مند۔

مسلسل تلاش و جستجو کے بعد مولانا تائبؔ کا بہت سا نعتیہ و منقبتیہ کلام حاصل ہوچکا ہے۔ جس کو شائع کرنے کا بندوبست کیا جائیگا۔ اُن کا کلام میرے دعویٰ کی دلیل ہوگی۔ فی الحال دو نعتوں اور ایک منقبت پر مشتمل اُن کا نمونہ کلام قارئین کے سامنے رکھوں گا۔ اس طرح سے قادر الکلام شاعر کی کچھ قدر و تعارف بھی ہوگا۔ اور صاحب نظر رکھا کرتے ہیں سچ گزر و حالی کہکشاں میں اُن تابناک ستاروں کو تلاش کریں جو ابھی تک ہماری کوتاہیوں اور غفلت شعاریوں کی وجہ سے ہماری نظروں

سے اوجھل رہے ہیں۔

پہلے میں مولانا تائب کی ایک مشہور کشمیری نعت ہدیۂ قارئین کروں گا جو تائب مرحوم نے اپنی وفات (۱۹۱۴ء) سے ایک برس قبل لکھی تھی۔

ہتہ آسِتھے بلے لوٗاَ برَدر کرم کر یا رسول اللہ
ہٹِر لدچھس متٕرہ تَم بر کرم کر یا رسول اللہ
رِفراسپنے ندا بوزم صدا بہ رخیوٗ ابو زُم
ژٕہ چھکھ شاہ گدا پرور کرم کر یا رسول اللہ
کرم یاعٔری ژٕ لیم خاعٔری بلیم یکبار بیماعٔری
بناداعٔری چھسَے مضطر کرم کر یا رسول اللہ
تمس کیا ہ غم یمِس یاوَر چھُہ دَر دنیا وَدر حشر
ترِسے پیٹھ وُہ غم خار پیغمبر کرم کر یا رسول اللہ
سہ چھاہ چھم غم کنِس جانَس بہ زانہ پوٗ شیخ شیطانس
دِلس چھُم زر زدس چھم شر کرم کر یا رسول اللہ
پوٗزم پردِس تہ بیگانس میٔہ کرِ دفا توٗزم پانس
گونٲہ کرٕ کرٕ بٔرِم دفتر کرم کر یا رسول اللہ
فراقہ چیا نہ ..... دیتہ تمی نالہ در دا نن
کھوٗ تگ یا منھ ژٕہ بر منبر کرم کر یا رسول اللہ
فراقہ چیا ہ دِ تی بارَد کنیو کو بَو تہ وۄن دیار
وفاتہ چیا نہ وُوتھ محشر کرم کر یا رسول اللہ
تمنا تائبس چھونے ژٕہ یکھتا اکھ شاہ سو
یتِم یادن وندسے بوسر کرم کر یا رسول اللہ

تائب مرحوم نے فارسی میں بہترین نعتیں لکھیں جو اپنی معنی آفرینی اور اثر انگیزی کے اعتبار سے نعتیہ ادب کی شاہکار ہیں۔ اسی قبیل کی ایک نعت ملاحظہ فرمائیے ؎

اے شاہدِ کل شاہ رسُل سدرہ سریری
طٰہٰ لقبی شمعِ شبی ماہ منیری

نورِ تو درآغازِ ظہوری تو در انجام
موجودِ نخستی و مقصودِ اخیری

یک حرف ز نعتِ تو بصد نامہ نہ گنجد
گو خامہ بود در کفِ علامہ دبیری

شد ختمِ نبوّت بتو اے فردِ نبوّت
آخر نظرے کن کہ منزّہ ز نظیری

مانندِ تو بر تختِ زمین تاجوری نیست
بر عرشِ بریں رفتہ زدی کوسِ امیری

جبریل جلودارِ تو اندر شبِ اسریٰ
کس را نبود با تو سرِ عرش مسیری

گیرم کہ بکف نیست مرا نقدِ نکوئی
از قصۂ من درگزری غصہ نگیری

در مدحِ مقامِ تو کہ محمود و معلےٰ است
بے جا بود اقدامِ مقاماتِ حریری

پیشِ تو عیانند ہمہ مظہر و مضمر
ای آئینۂ ذاتِ خدا صافِ ضمیری

من بے کس و لطفِ تو مرا در دو جہاں بس
تسکینِ دِ ہر مفلس و مسکین و فقیری

در خوف و رجا روز شب و شب شدہ روزم
سوزم کہ نذیری و فروزم کہ بشیری

دیدار اگر تا بہ قیامت نہ نمائی
وردِ چہ تواں کرد بایں دوری و دیری

منکر نہ شود آنکہ شد از امر تو معروف
در اجوبۂ اسولہ سخت منکیری

تائب بدرت آمدہ از روئے توقع
اے خوئے تو خوش عفو کنی عذر پذیری

اب میں مولانا تائب کا ایک مشہور منقبت قارئین کے سامنے رکھتا ہوں جو عربی، فارسی اور کشمیری میں ادا کی گئی ہے۔ اس منقبت سے خوب اندازہ ہو سکتا ہے کہ تائب مرحوم کو ان تین زبانوں پر کس درجہ کی عالمانہ دستگاہ حاصل تھی۔ تین زبانوں میں اشعار کو قافیہ کے سانچے میں یوں ڈھال دیا ہے گویا موتی ایک لڑی میں پرو دئے ہیں۔ یہ منقبت شعری خوبیوں اور معنویت میں بے نظیر رہی ہے۔ منقبت سید عبدالقادر جیلانیؒ کی شان میں لکھی گئی ہے جن کی ذات سے تائب مرحوم کو بے پناہ عقیدت تھی۔

اے نگاہِ تو عینِ آبِ حیات
چشم بد دور، نور در ظلمات

ما اسیریم در کمندِ غمت
ہم تو از بت رہبر بخش نجات

ما فقیریم و تو فقیر نواز
شیئاً للّٰہ انما الصدقات

مصدرِ لطفِ ذاتِ بیچونی
مظہرِ مصطفیٰؐ بحسن و صفات

نورِ عینِ علی علی التحقیق
در حسن یادگار در حسنات

قال للآل لا تقیسو فی
لعلوی علی اولی الدرجات

اشتیاقِ تو بُردہ خواب و خورم

اے فراقِ تو ہادم اللذّات
زندہ دل می شوم بدیدارت
اے پدیدار بر تو مخروفات
از فراقِ تو چشمہ شد چشمم
تا بکے تاب تشنۂ آب ذرت
ایہا الواقفون را حتہ
وصلہ ساحۃٌ من الکربات
ایہا المبعدون عن بلدہٖ
کم تعیشون دونہٗ ھیہات
حن قلبی وعشقٌ من بعدک
ان صبری علےٰ فراقک فات
تحنی ھٰذہٖ من الابیات
لتنی وجہہٗ ارا یومٌ
لیلۃ لیلۃً لدنیا فات
ساء حالی بسوء اعمالی
کن شفیعی وحن من الآفات
ان عند الفراق ساکنہٖ
ساعۃٌ ساعۃٌ فی الساعات
حیق حسینی سندٌ
سیدی من اکابر السادات
یا ملاذی ویا محی الدّین
لیت تحیی قلوبنا الاموات
غیر دیدارِ تو نخواہد دل
در شب و روز در حیات و ممات
از نصاری در رہزنان کردی

صاحبِ معرفت الوف و مسات
پیہر چھس ازگوناہ ییہر گوٗمت
چیہرِ دامن رٹے مےٗ واڈس وات
لوِلہ ہیارہ ہولہ چپانہٕ ....
ہاو دیدار چاو آبِ حیات
رب تجعل رجا لِی التائب
خیر رازِ تزید فی العرصات

اَلِف لَال

عربی "اَلفُ لَیلَتہ وَلَیلَتہ" کا کشمیری ترجمہ۔ یہ کتاب اپنی رنگارنگی کی وجہ سے ایک شاہکار مانی جاتی ہے۔ کشمیری ترجمہ پروفیسر محی الدّین حاجنی نے کیا ہے

مزید تفصیلات کے لئے

ہمارے شعبۂ مطبوعات سے خط وکتابت کیجئے

عبدالغنی شیخ

لداخ اور غیر ملکی سیاح

لداخ وسط ایشیا میں تجارت کا اہم مرکز ہی نہیں تھا بلکہ ماضی میں یہ من چلے سیاحوں اور مہم جو محققین کے لئے ایک پُرکشش گہوارہ بھی تھا۔ خاص طور پر انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں دنیا کے بہت سارے ممالک۔ برطانیہ، امریکہ، روس، چین، سویڈن، آسٹریا، ہنگری، بھوٹان، نیپال، فرانس، جرمنی، جاپان افغانستان، ناروے، ہالینڈ، اٹلی، سوئٹزرلینڈ وغیرہ سے ہزاروں سیاح لداخ وارد ہوئے۔ ان میں عام سیاح سے لیکر ماہرین حیاتیات، ماہرین نباتات، ماہرین حشرات الارض، ماہرین طبیعات، نقشہ ساز، آثار قدیمہ اور دوسرے شعبوں کے ماہرین تھے۔ ابتدائی دور میں سیاح اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر گھس پیٹھیوں کی طرح بلا اجازت لداخ میں داخل ہوتے لیکن جب ایسٹ انڈیا کمپنی اور وسطِ ایشیا کے مابین تجارتی معاہدہ ہوا سری نگر میں مقیم برطانوی ریذیڈنٹ لداخ جانے والے سیاحوں کو پروانہ رہداری جاری کرتا تھا۔ لداخ کی محدود پیداوار اور وسائل کے پیش نظر محدود تعداد میں سیاحوں کو لداخ جانے کی اجازت ملتی تھی۔ بہت سارے سیاحوں کو اپنی باری کا انتظار کرنا پڑتا تھا۔ کئی سیاح لداخ آکر اپنے قیام کی میعاد میں توسیع کرتے تھے۔ کئی دوبارہ لداخ میں سیاحت کی اجازت حاصل کرنے کے لئے درخواستیں دیتے تھے۔ موسمِ گرما میں سیاحوں کا تانتا بندھا تھا۔ لداخ کے بڑے بوڑھوں کا کہنا ہے کہ چند اہم منزلوں پر چولہے کی آگ ابھی گرم ہی ہوتی کہ دوسرا یورپی

سیاح پہنچ جاتا۔

یورپ کے سیاحوں نے لداخ میں کارہائے نمایاں سرانجام دیئے ہیں۔ انہوں نے لداخ کا چپہ چپہ چھانا۔ برفانی چوٹیاں سر کیں۔ گہری جھیلوں کی تہ معلوم کی۔ مختلف شاہراہوں کی پیمائش کی۔ چنگ چھنمو، قراقرم اور اکسائی چین کے بے آب و گیاہ میدانوں اور گھاٹیوں کی دشت نوردی کی۔ گلیشیروں پر راتیں گزاریں۔ کئی یورپی سیاحوں نے لداخی اور تبتی زبانوں میں مہارتِ تامہ حاصل کی۔ تمدن، ثقافت اور تاریخ کا گہرا مطالعہ کیا۔ لداخ کے آثارِ قدیمہ، نسل، طبعی ماہیت اور چٹانوں پر سائینسی تحقیقات کر کے کتابیں لکھیں۔ مختلف مقامات کی بلندیاں اور درجہ حرارت معلوم کیا۔ کئی سیاح لداخ کی بودھ خانقاہوں میں لوٹا جھوٹا کھانا کھاتے ہوئے علم، تجسس اور تحقیق کی پیاس بجھاتے رہے۔ کئی سیاحوں نے سفر کے دوران اپنی جانیں گنوائیں۔ آج بھی لیہہ کے عیسائیوں کے قبرستان میں انیسویں صدی کے دوسرے حصے میں آنے والے مشہور مہم جو سیاح سٹولیکزا STOLICZA • ڈیلگلیش DALGLEISH ہربرٹ ٹی ٹرنر HURBERT G. TURNER کی قبریں ماضی کی مہم جوئی کی یاد دلاتی ہیں

لداخ آنے والے ان سیاحوں میں کئی مہم جو اور من چلی عورتیں بھی گزری ہیں، مسز ہاروے ۱۸۵۰ اور ۱۸۵۱ میں دو مرتبہ لداخ آئی۔ دوسری مرتبہ وہ اکیلی تھی۔ اس نے اپنے سفر کے حالات اپنی کتاب - ADVENTURE OF A LADY, TARTARY, TIBET, CHINA AND KASHMIR. میں تحریر کئے ہیں۔

مسز BULLOCK WORKMAN نے ۲۲۸۰۰ فٹ بلند ایک چوٹی سر کی۔

ہالینڈ کی ایک خاتون مسز وِیسر MRS VISSER اور اس کے شوہر نے قراقرم کے گلیشیروں کا کھوج لگایا۔

لداخ پر لکھی گئی کتابوں میں ایسی اور کئی عورتوں کا تذکرہ ملتا ہے۔ ایک مقالے میں ان کے کارناموں کا احاطہ نہیں ہو سکتا۔

اس زمانے کا لداخ آج سے بہت مختلف تھا۔ سفر انتہائی کٹھن تھا۔ اوپر کے مقامات کا ذکر ہی کیا، سرینگر اور لیہہ کے درمیان راستہ اتنا خراب تھا کہ

گھٹنوں اور پیٹ کے بل چلنا پڑتا تھا۔ کہیں دشوار گزار چٹانوں پر راستہ پڑتا تھا۔ جہاں ہر لمحہ سینکڑوں منزل گہرائی میں گرنے کا خدشہ رہتا تھا۔

لداخ آنے والے بیسیوں سیاحوں نے اپنے سفرنامے، روزنامچے اور یادداشتیں تحریر کی ہیں جو اس زمانے کی سماجی، معاشرتی اور سیاسی زندگی پر روشنی ڈالتی ہیں۔

ان سفرناموں اور یادداشتوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے لئے لداخ کی سنگلاخ چٹانوں، بے آب و گیاہ میدانوں، کھاری جھیلوں اور برف پوش کہساروں میں بے پناہ کشش اور جاذبیت تھی۔ سخت جسمانی تکالیف اور بڑے مالی اخراجات برداشت کرنے کے بعد جب لداخ میں وہ اپنی منزل پا لیتے تو انہیں بے پایاں مسرت حاصل ہوتی اور بے ساختہ کہتے کہ ہماری ریاضت بیکار نہیں گئی۔

بہتوں کے لئے لداخ ایک عجوبہ تھا۔ ای۔ الیف۔ نائٹ نے اپنی کتاب WHERE THREE EMPIRES MEET میں لداخ کے "ریگستانوں" میں آباد شاداب بستیوں سے متعلق مسٹر شا کے بیان کے حوالے سے کہا ہے۔

"یہ (شاداب بستیاں) کسی اور ملک سے ٹکڑے تراش کر ریگستان میں رکھے ہوئے لگتے ہیں۔"

مذکورہ مصنف جب لداخ میں لامایورو کی بودھ خانقاہ میں پہنچا تو اس کی دلی کیفیت داستان الف لیلیٰ کے اس مسلمان شہزادے کی سی تھی جو بت پرستوں کے ایک عجیب و غریب ملک میں پہنچتا ہے۔

برطانوی سیاح گپت نے MAGIC LADAKH میں اپنے تاثرات ان الفاظ میں اظہار کئے ہیں۔

"عموماً برفانی چوٹیاں خصوصاً لداخ میرے لئے بے پناہ کشش رکھتا ہے ..... یہ سپنوں اور تخیلات کا دیش ہے ..... مجھے تعجب ہے مسٹر گاندھی لداخ کیوں نہیں آئے۔ یہاں وہ لگ بھگ وہ ساری چیزیں پا سکتے تھے جن کے وہ متلاشی ہیں۔ جب کبھی میں لداخ میں آیا۔ میرا میلان طبع گاندھی جی کے افکار کی طرف مائل ہوا۔"

سی۔ ای ٹنڈل بسکو نے اپنی کتاب KASHMIR IN SUNLIGHT AND SHADOW

میں لکھا ہے۔

"خانقاہوں اور لاموں کے اس عجیب و غریب ملک سے متعلق تاثرات بیان کرنا مشکل ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انسان تصورات اور خیالات سے ماورا ایک دُنیا میں آیا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ اپنے بدن کی چٹکی لے کر دیکھوں کہ آیا جاگا ہوں یا خواب دیکھ رہا ہوں"۔

اِن سیاحوں کے لئے لداخ کے کئی مقامات "جنت کے نظارے" رکھتے تھے۔ چنانچہ لارڈ ڈنیور لکھتے ہیں۔

"مغربی تبت (لداخ) میں وادی شایوک کو دیکھنے سے پہلے میں سوچتا تھا کہ کشمیر کے نظاروں کا ثانی نہیں"۔ ————

(لارڈ ڈنیور —— انڈ پامیر)

لداخ کے پہاڑوں سے متعلق یہاں پنڈت جواہر لال نہرو کے تاثرات پیش کرنا بے محل نہیں ہوگا۔ پنڈت جی نے ۱۹۱۶ء میں کشمیر کے پہاڑوں میں چند ہفتے گزارے تھے۔ زوجی لا کی چوٹی سے لداخ کے ننگے پہاڑوں کو دیکھ کر وہ بہت متاثر ہوئے۔ چنانچہ اپنی سوانح حیات میں وہ لکھتے ہیں۔

"وہاں فقط ننگی چٹانیں، برف اور یخ تھا۔ کہیں کہیں دل آویز پھول کھلے تھے۔ تاہم مجھے قدرت کے ان ویران اور ننگے گہواروں میں ایک عجب اطمینان ملا اور میں نے ایک بھرپور طاقت اور طمانیت محسوس کی"۔

ریورنڈ ہیبر REV. HEBER کی عیسائی مشنری سے وابستہ تھے وہ لداخ میں بارہ سال رہے۔ لداخ کے رسم و رواج ان کے لئے ایک معمہ تھے۔ موصوف اپنی کتاب HIMALAYAN TIBET میں لکھتے ہیں۔

"ہم یقیناً ایک عجیب و غریب سرزمین پر آئے ہیں۔ جہاں کا باوا آدم ہی نرالا ہے۔ جہاں اُلٹی گنگا بہتی ہے۔ ہمارے نظریئے میں جو اصول درست ہیں وہاں ان کے اُلٹ ہیں"۔

سیاحوں کے لئے لداخ کے ویران پہاڑوں، بے آب و گیاہ میدانوں

اور عجیب و غریب رسم و رواج میں ایک ایسی دلکشی تھی کہ ایک دفعہ یہاں آنے کے بعد دوسری مرتبہ دیکھنے کی حسرت رہتی تھی اور آرام و آسائشوں سے بھری پُری مہذب دُنیا میں پہونچ کر انہیں دلی افسوس ہوتا تھا۔ چنانچہ اے۔ ای۔ وارڈ اپنی کتاب THE TOURISTS AND SPORTSMAN'S GUIDE TO KASHMIR AND LADAKH میں رقمطراز ہے۔

"لداخ کے ننگے پہاڑوں اور میدانوں میں آخر کونسی کشش ہے کہ ہم کشمیر کے ہریالے مرغزاروں سے ان بنجر، بانجھ اور ویران علاقوں میں گھومنے جاتے ہیں؟ لیکن ہم پھر بھی جاتے ہیں اور بار بار جاتے ہیں" برطانوی سیاح GANPAT گنپت جب لداخ کے پہاڑوں کو پیچھے چھوڑ کر آتا ہے تو اظہار تاسف ان الفاظ میں کرتا ہے۔

"تہذیب کی عشرتوں اور گوناگوں آسائشوں سے قطع نظر جن کو کچھ لوگ زندگی کی اہم ضرورتیں قرار دیتے ہیں، تم درختوں سے ڈھکی ہوئی ان پہاڑیوں کی طرف پلٹ کر دیکھو گے جن کے پیچھے وہ دَرّہ پنہاں ہے جہاں سے تم آئے ہو اور تاسف کے دھیمے دھیمے احساس سے اُس طرف دیکھتے رہو گے۔"

قدیم لداخ سے متعلق مؤرخوں کو بہت کم مواد ملا ہے۔ مشہور چینی سیاح فاہیان، ہیون سانگ اور اوکونگ نے اپنے سفرناموں میں قدیم لداخ کا ذکر کیا ہے لیکن لداخ میں اُن کی آمد سے متعلق کوئی تاریخی ثبوت نہیں ملتا۔

پہلے پہل لداخ آنے والوں میں ایک نسطوری NESTORIAN مسیحی کا ذکر آتا ہے۔ وہ غالباً چودھویں صدی میں یہاں آیا تھا۔ لداخ کے سرحدی دیہات ٹانکیے میں قدیم سریانی میں ایک بڑے پتھر پر اس کے سفر کا تذکرہ نقش ہے۔

نسطوری مسیحی کے بعد سترھویں صدی میں دو پرتگالی پادری فادر انڈریڈ اور فادر اولیویرا لداخ آئے۔ وہ ۲۵ اکتوبر ۱۶۳۱ء کو لیہہ پہونچے۔ اِن دنوں مشہور راجہ سینگے نمگیل لداخ پر حکومت کرتا تھا۔

گوڈینو نامی سیاح ان کے بعد لداخ پہونچا۔

دو پرتگالیوں کی آمد کے چوراسی سال بعد دو اطالوی پادری فادر ڈیزیڈیری اور فادر فیرے FREYRE لداخ وارد ہوئے، ۲۷ جون ۱۷۱۵ء کو وہ

سری نگر سے روانہ ہوئے اور ۱۰ دن کی مسافت کے بعد ۲۶ر جون ۱۷۱۵ء کو لیہہ پہونچے۔ انہوں نے دشوار گزار راستوں اور سفر کی کٹھنائیوں کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔

مذکورہ سیاحوں کے علاوہ خود مختار لداخ کے دور میں آنے والے تین مغربی سیاحوں کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ یہ ہیں ولیم مور کرافٹ، جمیس بیلی فریزر اور ALEXAND-ER CSOMA KORAS۔ یہ انیسویں صدی کے اوائل میں لداخ آئے تھے ——— مور کرافٹ ستمبر ۱۸۲۰ء میں لیہہ پہونچا اور دو سال تک لداخ میں رہا۔ اس دوران اس نے لداخ کے تمام علاقے دیکھے۔ وہ یہاں ایسٹ انڈیا کمپنی کے لئے تجارتی مراعات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ چند مورخین نے لکھا ہے کہ مور کرافٹ کو برطانوی نوآبادیاتی حکومت نے ایک سیاسی چالبازی کے تحت خود مختار لداخ میں اپنی بالادستی اور اقتدار قایم کرنے کے لئے بھیجا تھا۔ ایک اور سیاح ٹریبیک اس کے ہمراہ تھا۔

الیکزینڈر سوما کوراس ALEXANDER CSOMA KORAS ہنگری کا رہنے والا تھا۔ مور کرافٹ سے دراس میں اس کی ملاقات ہوئی۔ وہ کئی برس تک زنسکار کے زنگلا گمپہ میں بودھی زبان سیکھتا رہا۔ بعد میں اس نے تبتی انگریزی لغت، تبتی گرمیر اور بودھوں کی ۱۱۲ جلدوں والی ضخیم مذہبی کتب پر ایک کتاب تصنیف کی۔

جمیس بیلی فریزر ان سے پہلے آیا تھا۔ ۱۸۲۰ء میں اس کا سفرنامہ شایع ہوا۔

لداخ میں وزیر زور آور سنگھ کے حملے کے آس پاس ایسٹ انڈیا کمپنی کا ایک ڈاکٹر ہینڈرسن ایک تبتی مسلمان کے بھیس میں دریائے سندھ کا منبع دریافت کرنے کے لئے لداخ پہونچا۔ لداخ کے راجہ نے ہینڈرسن کو تاڑ لیا۔ بعد میں راجہ نے وزیر زور آور سنگھ کی فوج کشی کے خلاف ہینڈرسن کو گرفتار کرکے سیاسی مقصد کے لئے استعمال کرنا چاہا۔ لیکن کامیاب نہیں ہوا۔ اسی دوران کشمیر سے برطانوی سیاح جی۔ ٹی وِگنے G.T. VIGNE لداخ پہنچا۔ وہ پہلا مغربی سیاح تھا جس نے سب سے پہلے بلتستان (جس کو چھوٹا تبت بھی کہا جاتا تھا) کی راجدھانی اسکردو کو دیکھا۔

لداخ آنے والے سیاحوں کو ہم پانچ گروپوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

۱۔ سیاسی اور تجارتی مقاصد پر لداخ آنے والے برطانوی ہند کے نمائندے

ان میں مورکرافٹ (۱۸۲۰ء) کپتان جے۔ ڈی کننگھم (دسمبر ۱۸۴۱ء) الیگزنڈر کننگھم (۴۷-۱۸۴۶ء) سرہنری لارنس وایڈورڈ لارنس (۱۸۵۰ء) وغیرہ کے نام آتے ہیں۔

کپتان جی۔ ڈی۔ کننگھم کو برطانوی ہند سرکار نے دسمبر ۱۸۴۱ء میں تبت کے علاقے پر زور آور سنگھ کی فوج کشی روکنے اور ڈوگرہ فوج کے انخلا کا مشاہدہ کرنے کے لئے بھیجا۔

الیگزنڈر کننگھم (مصنف لداخ) مہاراجہ گلاب سنگھ اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے مابین ایک معاہدے کے تحت لداخ اور تبت کی سرحد کے تعین کے لئے ۱۸۴۶ء اور ۱۸۴۷ء میں دو مرتبہ لداخ آیا۔

۲۔ لداخ کے راستے چینی ترکستان، تبت، چین اور روس جانے والے سیاسی، سائنسی اور تجارتی مشن

لداخ کے راستے چینی ترکستان، چین، تبت وغیرہ وقتاً فوقتاً سیاسی تجارتی اور سائنسی مہمیں روانہ ہوتی رہی ہیں۔ ان میں وسط ایشیا میں فورسیتھ کی مشہور مشن FOR-SYTH MISSION (۱۸۷۳ء) پامیر، یارقند اور وسط ایشیا میں ینگ ہسبنڈ کی سیاسی مہم (۱۸۹۰ء) پامیر سر کرنے کے لئے لارڈ ڈنمور کی مہم (۱۸۹۲ء) پیکنگ میں کپتان سرنی مکولم اور کپتان ویلبے (۱۸۹۶ء) کی مشن اور کئی مہمیں شامل ہیں۔

چینی ترکستان اور صحرائے لوب نور میں آثار قدیمہ کے انمول خزینے کی تلاش میں یہاں سے کئی سائنسی مہمیں گزری ہیں۔ یورپی مشن ہمیشہ لداخ سے جفاکش اور تجربہ کار قلی ساتھ لیتے تھے۔

سرارل سٹین نے (۱۶۔۱۹۱۳ ـ ۸ ـ ۱۹۰۶ ـ ۱۹۰۱ء) اور ایم ایلیٹ
(M. ELLIOT ۸ - ۱۹۰۶ء) نے چینی ترکستان اور صحرائے لوب نور کی کھدائی کی اور
پرانی تصویریں، مخطوطات اور دوسری نادر اشیا نکالیں جو برٹش میوزیم کی
پوری ایک گیلری کی زینت بنی ہیں۔

امریکی صدر روزویلٹ کے دو بیٹے مسٹر تھیوڈی روزویلٹ جونیئر اور
کرنل تھیوڈور ۱۹۲۶ء میں ایک سائینسی مہم پر لداخ سے چینی ترکستان روانہ ہوئے تھے

۳۔ موراوین اور کیتھولک مشنوں کے محققین

۱۸۷۵ء میں موراوین مشن نے لیہہ میں اپنی ایک شاخ قائم کی۔ اس
کے پندرہ سال بعد ۹۱-۱۸۹۰ء میں کیتھولک مشن کا قیام عمل میں آیا۔

تبلیغی مقاصد سے قطع نظر، مشن کے ڈاکٹروں اور پادریوں کی زندگی
ایثار، قربانی، بے لوث خدمات اور علمی تحقیقات کی ایک طویل داستان ہے۔ لداخیوں
میں مشن کے ارکان بہت مقبول تھے۔ انہوں نے زندگی کا بڑا حصہ یہاں گزارا اور کئی یہاں
کی زمین میں جذب ہوئے۔

مشن سے وابستہ کئی ارکان نے لداخی اور تبتی زبانوں میں ید طولیٰ
حاصل کیا۔ لداخ کی تاریخ، تمدن اور زبان پر دور رس ریسرچ کئے۔ ان میں ڈاکٹر کارل
مارکس، ڈاکٹر ارنسٹ شاوے۔ ایچ فرانکی ہیبر وغیرہ مشہور ہیں۔

۴۔ قدرت کے سربستہ رازوں کو انکشاف کرنے والے مہم جو سیاح اور سروے پر آنے والی ٹیمیں

اس زمرے میں بہت سارے مہم جو اور من چلے سیاحوں کے نام آتے ہیں۔
ADOLPHE SCHLAGINTWEIT پہلا یورپی سیاح تھا جس نے
۱۸۵۷ء میں لداخ کے اکسائی چین اور چنگ چھنمو کے ویران اور دشوار گزار خطے کو عبور
کیا اور چینی ترکستان پہنچا۔

۱۸۶۵ء میں لداخ کے گورنر جانسن نے اسی خطے سے چینی ترکستان تک

سفر کیا۔

۱۸۶۸ء میں ہیورڈ، شا اور کیلے نے یکے بعد دیگرے چینگ چھنمو اور اکسائی

چین عبور کئے۔ اِن کے علاوہ متعدد یورپی سیاحوں کے نام آتے ہیں جنہوں نے لداخ میں

اکسائی چن کی بلندیوں، قراقرم کے گلیشروں، اونچے پہاڑوں، جھیلوں اور دشوار گزار دروں

کا سروے کیا۔ اِن میں گوڈوین آسٹین [illegible] DREW [illegible] (۱۸۶۲ - ۶۳ء) –

منٹگمری (۱۸۷۱ء) ڈریو (۱۸۷۰ - ۷۳ء) ٹروٹر (۱۸۷۳ء) رچرڈ لیڈیکر (۱۸۷۵ - ۸۲)

تالبوٹ (۱۹۰۷ء) ہیڈن (۱۹۰۶ - ۸ء) ڈاکٹر فیلیپو فیلیپی (۱۹۱۳ - ۱۴ء) مسٹر اور مسز

ولیسر (۱۹۲۵ء) وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

چین کا دعویٰ ہے کہ ۱۸۹۱ء میں دو چینی افسر ہنے تین اور لی یوآن

پینگ کی سرکردگی میں اس کی دو ٹیموں نے لداخ کے اکسائی چین و لیفگر کی تھنگ کی

جنوب مغربی اور شمال مغربی سرحدوں کا الگ الگ سروے کیا۔

لداخ آنے والوں میں ایک روسی سیاح ایم۔ ایس۔ نکولس نوٹووچ

M. S. NICOLAS NOTOVITCH کا نام قابلِ ذکر ہے۔ وہ ۱۸۸۷ء میں

لداخ آیا تھا اور ہمس کی مشہور خانقاہ میں اپنی ٹانگ کا علاج کراتا رہا۔ نکولس نے اپنی

کتاب LIFE OF CHRIST میں لداخ میں حضرت عیسیٰ کی آمد کا حوالہ دیا ہے

اس اختلافی کتاب کی اشاعت سے تہلکہ مچ گیا۔

۵۔ لداخ آنے والے سیاح

لداخ آنے والے سیاحوں کی بھاری اکثریت مذکورہ بالا مہم جو سیاحوں

اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے بھیجے گئے نمائندوں سے مختلف ہے۔ یہ "سیاح" کے عام مستعمل اور مسلمہ

معانی پر پورا اترتی ہے۔ یہ سیلانی شکار کھیلنے، بدھ خانقاہیں دیکھنے، عجیب و غریب

معاشرت اور رسوم کا مطالعہ کرنے اور ذوقِ سیاحت کی تسکین کے لئے لداخ آتے تھے۔

لداخ کے ننگے پہاڑوں اور میدانوں میں دنیا کے چند مشہور جنگلی جانور پائے

جاتے ہیں۔ یہاں کا جنگلی بکرا ساری دُنیا میں مشہور ہے۔ اس کی کئی قسمیں ہیں۔ کسی نے لداخ کو OVIS POLI (ایک قسم کا جنگلی بکرا) کی سرزمین کہا ہے۔ اس کے علاوہ یہاں مارخور، IBEX (ایک مشہور ہرن)، برفانی چیتے، جنگلی یاک، جنگلی گدھے، تبتی غزال، آہو، بارہ سینگے، مرگ وغیرہ پائے جاتے ہیں۔ لیکن ان میں سے کئی نسلیں اب معدوم ہو گئی ہیں۔ ان شکاریوں میں جنرل کنیلوچ، جنرل میسین ٹائر MACINTYRE، کرنل ڈورانڈ، کرنل وارڈ، کرنل ہیر جیسے برطانوی ہندوستانی فوج کے اعلیٰ افسروں کے نام قابلِ ذکر ہیں، جنھوں نے اپنے شکار کے تجربات کو کتابی صورت دی۔ یورپ کے شکاری یہاں جنگلی بکروں کے خوبصورت اور لمبے سینگ جمع کرتے تھے، جن کو وہ اپنے ڈرائنگ روم کی زینت بناتے یا برٹش میوزیم اور عجائب گھروں کی نذر کرتے۔ کئی لداخی جنگلی جانور یورپ کے [illegible] محققین کے ناموں سے منسوب ہیں۔ لداخ کے مشہور جنگلی بکرے "نیان" کو HODGSON'S SHEEP "شاپو" کو VIGNE'S SHEEP اور خرگوش کی ایک قسم کو STOLICZKA'S MOUSE HARE کہتے ہیں۔

لداخ آنے والے بہت سارے یورپی سیاح یہاں کی بدھ خانقاہوں، مورتیوں، مصوری کے اعلیٰ نمونوں، ناچ اور نغموں میں دلچسپی لیتے تھے۔ لداخ میں دستیاب چینی پیالیاں، اژدہا اور دوسرے بیل بوٹوں والے چینی کپڑے، تبتی برتن، نقرئی چائے دانیاں، قالین، چینی ترکستان کا ریشم اور دوسری مصنوعات سیاحوں کو لداخ کھینچتی تھیں۔

آج لداخ میں ملک اور بیرونِ ملک کے سیاحوں کے داخلے پر ایک حد تک پابندی عائد ہے لیکن کبھی کبھی ذوقِ سیاحت کسی کو لداخ کھینچ لے جاتا ہے اور دورِ رفتگاں کی یاد دلاتا ہے۔ اس سال (۱۹۷۳ء) گرمیوں میں چند امریکی اور انگریز سیاح، جن میں دو عورتیں بھی تھیں، پاٹن کے جنگلات سے ہوتے ہوئے وادیٔ وردوان کے درّے سے خطرناک گلیشیر پر چل کر پا پیادہ اچانک کرگل پہنچے جہاں سے وہ واپس بلائے گئے۔

وسط ایشیا سے تجارتی تعلقات منقطع ہونے کے بعد تجارتی لحاظ سے لداخ کی افادیت ختم ہو گئی ہے۔ جن تجارتی شاہراہوں پر صدیوں تک [illegible] ہوتی

گھنٹیاں باندھے، اونٹوں کی قطاریں، نمک کے تھیلے اور اون کے گٹھے اٹھائے ہزاروں بھیڑ بکریاں سر جھکائے آسمان تک گرد و غبار اڑاتیں نیز سرا تاجروں کے قافلوں اور خانہ بدوشوں کے جلو میں گزرتی رہیں، وہاں ۱۹۶۲ء میں چینی جارحیت کے نتیجے میں توپوں اور مارٹروں کے دھماکہ خیز گولے پھٹنے لگے۔ جن سنگلاخ چٹانوں اور خاموش گھاٹیوں میں کبھی کوئی سر پھرا سا من چلا سیاح پیٹھ پر جھولا اٹھائے اپنے سینے میں حصول علم اور جستجو کی تپش لئے گھومتا تھا وہاں اب عجب سا تناؤ اور بے چینی نظر آتی ہے۔

عبدالاحد رفیق

کشمیریوں کی فوجی روایت

یہ کہنا یا سمجھنا کسی بھی طرح درست نہیں کہ کشمیری جنگجو، شجاع اور پکے دل و ارادے کے مالک نہیں ہیں۔ اگلے وقتوں سے جو لوگ وادی کے مکینوں کا جائزہ لیتے رہے ہیں، اُن کے بیانات کے مطابق یہ حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ اِن لوگوں نے وادیٔ کشمیر کی سیر اُس وقت کی جب کہ کشمیر ظلم و تعدی کے دور سے گزر رہا تھا۔ دوسرے ان سیاحوں نے اپنی رائے ہیون سانگ کے بیان پر قائم کی ہے جس نے بارہ سو سال پہلے کشمیر کا دورہ کیا تھا۔ بدقسمتی سے ہیون سانگ کشمیر میں بہت کم مدت تک رہا اور عام لوگوں سے ملنے کا اُسے بہت کم موقعہ ملا۔ اُس وقت کشمیر کا سماج ہندوستان کی دوسری ریاستوں کی طرح چار مختلف طبقوں میں منقسم ہو چکا تھا اور برہمنوں کا طبقہ سب طبقوں پر غالب تھا۔ اگرچہ راجہ ایک شودر ذات کا آدمی تھا۔ ہیون سانگ صرف برہمنوں کی جماعت میں گھومتا رہا اور عام آدمیوں کے ساتھ اس کا میل ملاپ نہ تھا اور ظاہر ہے کہ برہمن لوگ مذہبی اور تعلیمی اُمور کے علاوہ کوئی اور کام انجام نہیں دیتے تھے۔ ان کو فوجی اور ملکی اُمور میں کوئی اہمیت حاصل نہ تھی۔ ہیون سانگ لکھتا ہے۔

"لوگ چمڑے کی صدری اور کتان کے بنے ہوئے کپڑے پہنتے تھے۔ وہ چھچھورے، ہلکے، سبک سر، ڈرپوک، کمزور اور کم ظرف تھے۔ ان کی چال ڈھال خوبصورت

دکھائی دیتی تھی۔ مگر حد درجہ کے مکار تھے۔ پڑھنے، لکھنے اور علوم و فنون کے سیکھنے کے ساتھ ان کو بڑی دلچسپی تھی۔ ہندو مت اور بدھ مت دونوں مذہبوں کے ماننے والے موجود تھے"[1]

اسی طرح انیسویں صدی کی ابتداء میں جو سیاح کشمیر آئے ہیں۔ انھوں نے کشمیر کے بارے میں کیا کہا ہے۔ اس کا بھی جائزہ لینا ضروری ہے۔ اگرچہ ان سیاحوں کیلئے حاکم وقت رنجیت سنگھ کی طرف سے رہائش اور کھانے کا بندوبست معقول اور موزوں طور پر کیا گیا تھا۔ ان کو طرح طرح کی سہولیتیں میسر تھیں اور ان کے اخراجات کا سارا بوجھ سکھ حکومت برداشت کرتی تھی۔ اس کے علاوہ یہاں کے صوبیدار ان کو نقدی روپیہ بطور نذرانہ پیش کرتے تھے۔ مگر یہ تمام سیاح ناشکر گزار ثابت ہوئے اور عیب جوئی میں محو ہوگئے۔ اور وہ مہمان جو اپنے میزبان کا بے حد ناشکر گزار ہو اور ان تمام سہولیات کو فراموش کردے جو اس کو میسر کی گئی ہوں، قابل اعتماد نہیں ہے۔ اور اس قسم کے لوگوں سے کبھی یہ توقع نہیں کی جاسکتی ہے کہ وہ حقائق پر مبنی حالات بہم پہنچائیں۔ ان سیاحوں نے کشمیر کی صورت حال کو فراموش کردیا ہے۔ بلکہ یہ بھی کہا کہ کشمیری کو کبھی اپنی دوستی کے دائرے میں شامل نہیں کرنا چاہیئے۔ اگر سانپ ملے تو اس کو موت کے گھاٹ اتار دو مگر کسی کشمیری کو قتل کئے بغیر نہ چھوڑ دو۔ یہ لوگ دھوکے باز مکار، اور پُر فریب ہیں۔ یہ ہنگامہ پرست اور شور مچانے کے عادی ہیں۔ جب کوئی ان پر غالب ہوجاتا ہے تو بھاگ جاتے ہیں اور مغلوب ہوکر بچوں کی طرح روتے ہیں۔ دل کے کچے اور کمزور ہوتے ہیں۔[2]

افسوس کا مقام ہے کہ یہ سیاح عام طور پر ہانجیوں کے ساتھ رہتے تھے اور ان کا تعلق ان کے ساتھ ہوتا تھا۔ یہ طبقہ کشمیر میں جہالت، لاعلمی، مفلسی اور متواتر غلامی کی وجہ سے ان تمام صفات سے عاری تھا۔ جو اخلاق حسنہ میں شامل ہیں۔ اس کیمونٹی کو کلاً جاہل نہیں کہا جاسکتا بلکہ ان میں بھی بعض افراد اعلیٰ اخلاق اور

---

1. CIVILIZATION IN ANCIENT INDIA R.C. DUTT VOL II P. 186
2. DREW - THE TERRITORIES OF JAMMU AND KASHMIR P. 175.

کردار کے مالک ہیں۔ تاہم ایک خاص طبقے کے اخلاق اور کردار کو ساری قوم کا اجتماعی کردار نہیں بنایا جاسکتا ہے۔ مسٹر ڈریو (DREW) خود ہی ان تاثرات کی تردید بھی کرتے ہیں۔ چنانچہ آگے چل کر وہ لکھتے ہیں۔

"مجھے اس بات کا اعتراف کرنا چاہیئے کہ میں اکثر اوقات ان کشمیریوں سے ملا ہوں جو خطرے کے وقت جان جوکھوں میں ڈال کر بہادری کے ساتھ مقابلہ کرتے ہیں۔ دماغی صلاحیتوں میں کشمیری اپنے پڑوسیوں سے افضل ہیں۔ کشمیری پنجابیوں کے برعکس اعلیٰ صلاحیتوں اور لیاقتوں کے مالک ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کشمیری اپنے حکمرانوں یعنی ڈوگروں سے زیادہ حساس اور باشعور ہیں"[1]

مسٹر ڈریو (DREW) مخلصانہ اعتراف کرتے ہیں کہ عام طور پر جو رائے کشمیریوں کے بارے میں یورپین سیاحوں نے قائم کی ہے وہ محض ہانجی طبقہ کے متعلق ہوسکتی ہے۔ کیونکہ یہ طبقہ وحشیانہ ظلم وستم کی وجہ سے کافی لاعلم اور غیر مہذب تھا۔ پسماندگی کی بنیاد جہالت ہی کو قرار دیا جاسکتا ہے۔ مسٹر ڈریو (DREW) آگے چل کر لکھتے ہیں

"ہانجی طبقے کے ساتھ یورپین سیاحوں کا زیادہ میل ملاپ ہوتا ہے ان کو دیکھ کر وہ ساری کشمیری قوم کے متعلق غلط رائے قائم کرتے ہیں۔ تاہم ان لوگوں میں عمدہ صلاحیتیں موجود ہیں۔ چنانچہ ان کی پیشہ ورانہ صلاحیتیں بعض اوقات ہمیں حیران کر دیتی ہیں۔ وہ ہر وقت نئی نئی چیزوں کے بنانے میں مصروف رہتے ہیں۔ وہ کمانے کے سلسلے میں زیادہ لالچی واقع ہوئے ہیں۔ اور کمائی کے بارے میں وہ مطمئن نہیں ہیں بزدلی جو کشمیریوں کی سیرت کا ایک حصہ ہے۔ ہانجی طبقہ میں اس وقت مشاہدہ کی جاسکتی ہے۔ جب کہ یہ لوگ آندھی اور طوفان میں گرفتار ہو جاتے ہیں"۔

مسٹر ڈریو کا مندرجہ بالا بیان متضاد خیالات کا آئینہ دار ہے اور خود ہی وہ اپنے دعوؤں کی تردید کرتے ہیں اور بعض صلاحیتوں کو تسلیم بھی کرتے ہیں۔ پھر بھی یہ بات ذہن نشین کرنی چاہیئے کہ ان سیاحوں نے کشمیریوں کی سیرت اور چال چلن کے بارے میں جو کچھ بیان کیا ہے وہ محض لگاتار صدیوں کی غلامی کی

---

1. DREW:- THE TERRITORIES OF J&K P. 177

وجہ سے ہوا ہے۔ بقول علامہ اقبال غلامی میں قوموں میں ضمیر تک بدل جاتا ہے۔ ظالم صوبیداروں اور حاکموں نے ظلم و ستم، جور و جفا کی وجہ سے اس قوم کا کچومر نکالا تھا اگر ان پر مہربان اور رحم دل حکمران ہوتے تو ان کی ہمت و عظمت ایک نیا ہی جلال و جمال پیدا کرتی۔ چنانچہ ذیل کے بیان سے اس کی تائید کی جاسکتی ہے۔

"کشمیر براعظم ایشیا کی تہذیب و تمدن کا مرکز بن جائے گا۔ ایک منقش انگلستان ایشیا کے قلب میں۔ واقعی ایک مشرقی سیاح کے لئے باعث کشش ہوگا اور جس کو وہ "دنیا کا شمالی ہیرا" سمجھے۔ ایک تفریح گاہ جہاں وہ دور دراز مقامات سے آنا پسند کرے"[1]

عوام کی سیاسی حالت کی چھاپ ذیل کے بیان سے منعکس ہوتی ہے،

"کشمیر کی سالانہ پیداوار ۲۵ لاکھ سے زائد نہیں ہے اور سکھ حکمران اس پیداوار کا نصف بھی خرچ یہاں نہیں کرتے ہیں۔ سکھ حکمران کشیر یوں کو اس قدر بزدل اور نامرد سمجھتے ہیں کہ انھوں نے یہاں بہت کم محافظ فوج رکھی ہے۔

کشمیر ایک زرخیز خطہ تھا۔ یہاں پیداوار کافی ہوتی تھی اور خطہ کی اکثر آبادی کھیتی باڑی پر اپنا گزارہ کرتی تھی۔ سلاطین کشمیر کے بغیر کسی حکمران نے زراعت کو ترقی دینے کے وسائل کی وسعت کی طرف توجہ نہیں دی۔ بلکہ تاریخ شاہد ہے کہ مغلوں، افغانوں اور سکھوں کے دور میں کاشتکاروں کو دو وقت روٹی بھی میسر نہ ہوتی تھی۔ ملک میں فوجی حکومت تھی۔ قانون، عدالت کا نام و نشان نہ تھا۔ کشیر کی حیثیت ایک نو آبادی کی تھی۔ حکمران کے سامنے صرف یہ مقصد تھا کہ یہاں سے جتنا روپیہ وصول ہو سکے، حاصل کر کے دہلی۔ کابل اور لاہور بھیجا جائے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ یہاں عوام یا ملک کے لئے کوئی مفید کام انجام نہیں دیا جاتا تھا۔ صحت عامہ، تعلیم اور صنعتی ترقی تو درکنار ریاست میں یہ حکمران زرعی ترقی کی طرف بھی کوئی دھیان نہیں دیتے تھے، جس سے ان کو کبھی کافی فائدہ ملتا تھا۔ مالیہ وصول کرنے کے طریقے اس قدر سخت تھے کہ رشوتیں، جرمانے اور بد دیانتی

1. VIGNE:- TRAVELS IN KASHMIR VOL. II P. 68

روز کا معمول ہو گئے تھے۔ کسانوں کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ قحط سالی، وبا اور سیاسی ابتری کی وجہ سے اقتصادی بدحالی میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ کشمیر کے امراء کو حکمرانوں نے لالچ دیکر اپنے ساتھ ملا دیا تھا۔ غریب عوام کا کوئی یار و مددگار نہ تھا۔ افغانوں کے دور میں شالبافی کو ترقی ملی باقی سب دوروں میں صنعت و حرفت کی حالت خراب تھی۔ سکھوں نے شال کا محصول جاری کر کے شالبافوں کی کمر توڑ دی۔ حکمرانوں نے یہاں آکر اپنی بگڑی ہوئی قسمت بنائی۔ عوام کی خوشحالی اور فارغ البالی کا ان کو کوئی خیال نہ ہوتا تھا۔ کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ زندگی میں بار بار اس قسم کے مواقع میسر نہیں آسکتے ہیں۔ آج اگر کشمیر کے حکمران ہیں تو کل انہیں دہلی، کابل اور لاہور واپس بلایا جائے گا۔ کوئی کشمیری مظلوم کسی حکمران کے خلاف اپیل کرنے کا مجاز نہ تھا۔[1]

ان حالات میں ایک مظلوم قوم غیر مسلم ہو کر لڑتی کیسے؟ کیوں کہ اکبر نے کشمیریوں سے ۱۵۸۶ء میں ہتھیار چھین لئے تھے اور ان پر فوجی ملازمت کے دروازے بند کر دیئے تھے۔ پس وہ فوجی تربیت حاصل کرتے کیسے؟ متواتر غلامی کی وجہ سے یہ قوم جمود اور تعطل کا شکار ہو چکی تھی۔ اب اس قوم کے سامنے بجز اطاعت شعاری اور فاتح کے سامنے بحیثیت مفتوح کے اور کیا چارہ تھا۔ مغلوں کے دور تسلط کے ساتھ ہی یہاں کی سیاسی حالت خراب ہو گئی تھی۔ افغانوں کے دور میں مزید بھی خراب ہو گئی۔ سکھوں نے تو قیامت بپا کی۔ سکھوں کے دور میں ایک جج کی تقرری تب عمل میں لائی جاتی تھی جب کہ سائل ایک زر کثیر پیش کرتا تھا۔[2]

کشمیر کی خود مختاری ۱۵۸۶ء میں ختم ہو گئی۔ جب کہ اکبر نے کشمیر کو قوت اور طاقت سے نہیں بلکہ مکر و فریب سے فتح کر لیا۔ ۱۵۸۶ء سے ۱۹۴۷ء تک کشمیر لگاتار غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا اور ظلم و ستم کے پہاڑ یہاں کے عوام پر توڑے گئے۔ یہاں تمام سیاسی کششوں کو دبایا گیا تھا اور کشمیریوں کے ساتھ حیوانوں جیسا سلوک روا رکھا جاتا تھا۔ کشمیر کی کم و بیش یہی حالت ڈوگروں کے

---

1. CALCUTTA RENIEW 1844 VOL. II P. 624

2. MOORCRAFT. TRAVELS IN KASHMIR VOL II P. 126

آنے تک تھی۔

قدیم دور میں جب کہ کشمیر میں ہندو راجے حکمران تھے۔ کشمیریوں نے اپنی بہادری کا سکہ نہ صرف پڑوسی علاقوں پر بٹھایا تھا۔ بلکہ سارا وسط ایشیا کشمیری فوج سے لرزہ براندام ہو رہا تھا۔ چنانچہ ان مہاراجوں نے قنوج، بنگال اور جنوبی ہندوستان کو فتح کرنے کے علاوہ لنکا کو بھی تسخیر کر لیا تھا۔ افغانستان، قندھار، کاشغر اور پامیر پر بھی کشمیری جھنڈا گاڑھا تھا۔ اشوک۔ سمندر گپتا، ہرش وردھن، علاء الدین، فیروز شاہ تغلق، اکبر اور اورنگ زیب مضبوط دل و دماغ اور قوی ہیکل تھے۔ ان تمام بادشاہوں نے اپنی سلطنت کو وسیع کر کے اپنا سکہ قائم کیا تھا۔ یہی حال کشمیر کے راجاؤں کا بھی تھا یہ راجے بہادر، قوی اور دھن کے پکے تھے۔ ہمیشہ اپنی سلطنت کو وسعت دینے کی فکر میں لگے رہتے تھے۔ ان کی فتوحات کے کارناموں سے راج ترنگی کے اوراق بھرے پڑے ہیں۔

راجہ مہر کل جو کہ واسو کل کا بیٹا تھا۔ بقول ایلیٹ (ELLIOT)[1] ۷۰۷ ـ ۶۴۷ ق۔م میں کشمیر کا حکمران تھا۔ مگر وقائع نگاروں کے بیان کے مطابق ۷۰۷ ق۔م میں تخت نشین ہوا تھا۔ اس کے عہد میں ایک نرکنائی سردار نے کشمیر پر حملہ کیا تھا۔ مگر مہر کل نے اس کو شکست دی۔ مہر کل نے سارے ہندوستان کو فتح کر لیا۔ اکثر مورخوں نے اس راجے کو ظالم قرار دیا ہے۔ ہندوستان فتح کرنے کے بعد اس نے لنکا کو بھی اپنی فتوحات میں شامل کر لیا۔ قندھار پر چڑھائی کر کے اس کو اپنی مملکت میں مدغم کر دیا۔

لیگواہن ۲۲۳ ق۔م سے ۱۰ء تک کشمیر پر راج کرتا تھا۔ تمام مورخوں نے راجہ مذکورہ کو کشمیر کا بہادر راجہ قرار دیا ہے۔ عدل و انصاف کا پتلا تھا، بدھ مت کا پیروکار تھا۔ اپنے ارد گرد علاقوں کو فتح کرنے کے بعد تمام راجاؤں سے جانور کشی چھڑائی۔ جنوبی ہندوستان کو فتح کرتا ہوا لنکا تک جا پہنچا اور تمام حکمرانوں سے حفاظت حیوانات کا حلف لیا۔

---

1. ELLIOT'S HISTORY OF INDIA VOL I, P. 165.

راجہ پیروسین نے سنہ ۱۲۳ء میں سنہ ۱۸۳ء تک کشمیر پر حکومت کی اور پیروسین پورہ یعنی موجودہ سرینگر اسی راجہ کا آباد کردہ ہے۔ چنانچہ گجرات اور مغربی گھاٹ کا سارا علاقہ فتح کرکے کشمیر کی سلطنت میں ملا دیا۔ شیلادت راجہ اجین کے بیٹے کو اس کے دشمنوں نے مالوہ سے نکال دیا۔ مگر راجہ نے اپنے زور بازو سے اس کو دوبارہ فتح کر لیا اور شیلادت کے سپرد کر دیا۔ اس کے بعد راجہ نے ترکستان کی جانب توجہ کی اور اس سلطنت کو فتح کرتا ہوا کامران کشمیر لوٹا۔[1]

راجہ مکتا پیڈ عرف للتادت، کشمیر کے راجاؤں میں اپنی بہادری، ہمت اور شجاعت کے لحاظ سے سرفہرست ہے۔ وہ عالم تھا۔ اور اس کے دربار میں بہت سے عالم اور بعض ماہرین فنون ہمیشہ موجود ہوتے تھے۔ وہ نہ صرف کشمیر کے راجاؤں میں بلند اور اعلیٰ سمجھا جاتا تھا۔ بلکہ ہندوستان کے راجاؤں میں بھی اس کی عظمت اور برتری مسلّمہ ہے۔ مورخوں نے اس کے فتوحات کا ذکر بڑھ چڑھ کر کیا ہے۔ جب محمد بن قاسم ملتان کے راجہ داہر سے مکتا پیڈ للتادت کے بارے میں پوچھ گچھ کرتا ہے۔ تو راجہ داہر لکھتا ہے۔

"قہر کنندہ روئے زمین است و انتقام کشندہ و جابرہ حسب نسب راجہاں کہ در ملک کشمیر صاحب چتر و نوبت و علم و رایت کہ آیان ہند سر بر آستانہ دولت او نہادہ اند۔ و جملہ ہندوستان و سندھ در تخت از فرمان شد۔ و برادر مکران و توران امرائے بر رقبہ خود قلادہ کردہ صاحب صد زنجیر پیل است و راکب پیل سفید است کہ نہ اسپ او مقابل تواند و نہ زد باوے تواند ارتو اجازت کردمی تا شما دست بر دری کردے کہ تا انفرام عالم ہیچ لشکرے مجال نبود کہ پیرامون حدود او بگذشتے"[2]

راج ترنگنی کے بیان کے مطابق راجہ مکتا پیڈ للتادت کو ہندوستان کے تمام راجے باج ادا کرتے تھے۔ اس کی سلطنت ایک طرف بلوچستان اور دوسری جانب ترکستان تک پھیلی ہوئی تھی۔ بڑے بڑے جابر سردار اس کے سامنے جھک جاتے تھے اور بہادروں کا پتا پگھل جاتا تھا۔ روس کے اکثر علاقوں پر قبضہ کرکے روسیوں کے چھکے

---

[1] تاریخ حسن جلد دوم

[2] چچ نامہ صفحہ ۱۱۲۔ یہ کتاب ڈاکٹر محمد ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ ڈی نے انگریزی میں ترجمہ کی ہے۔ اصلی کتاب ۱۲۱۶ میں لکھی گئی ہے۔

چھڑائے۔ اپنی فوج کو اپنے دورِ حکومت میں کبھی بے کار رہنے کا موقع نہ دیا۔ بنگال کو بھی اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ قنوج کے راجے کو ان کے دربار کا شاعر بننا پڑا۔

راجہ نے سندھ کے بغیر تمام ہندوستان کو اپنی بہادر افواج کی مدد سے فتح کر لیا تھا۔ راجہ نے شمالی، مغربی، مشرقی اور جنوبی ہندوستان کو فتح کرنے کے بعد تبت کی جانب توجہ کی اور ماوراء النہر کو روندتا ہوا ترکستان کے تمام ممالک اپنی مقبوضات میں ملا دیئے۔ راجہ کی اس فوج میں صرف کشمیری النسل کے افراد شامل تھے۔ اسی راجے کے دور میں بہادر کشمیریوں نے ٹرانس کاکیشیا کا دور دراز اور ناقابل تسخیر علاقہ بھی فتح کر لیا۔ یہ پہلا اور آخری راجہ تھا جس نے ہندوستان کے راجاؤں میں اتنا کمال کیا کہ ہندوستان کی سرحدوں سے پار جا کر روس اور چین کے علاوہ وسط ایشیا کے اکثر علاقوں پر اپنا تسلط جما کر دنیا کو محوِ حیرت بنا دیا تھا۔ ترکوں کی بہادری دنیا کے اقوام میں ضرب المثل بن چکی ہے۔ مگر کشمیری افواج کے مقابلے میں ان کی کچھ نہ چلی تھی۔ کیا کشمیری قوم کو بزدل اور ڈرپوک کہا جا سکتا ہے؟ اس کشمیری قوم نے دنیا کی خونخوار قوم یعنی ترکوں کے دانت کھٹے کر دیئے تھے اور مدت مدید تک نہ صرف کشمیر بلکہ سارے ہندوستان کو ان وحشیوں سے نجات دلائی تھی۔

راجہ ہکتا پیڈ للتادت کا پوتا راجہ جیا پیڈ ۷۶۲ء میں تخت نشین ہوا۔ اور ۷۹۷ء تک حکومت کی۔ یہ راجہ بھی بہادر اور جری تھا۔ اس نے پنجاب اِلہ آباد کو فتح کرنے کے بعد سارے شمالی ہندوستان پر اپنی بہادری کی دھاک بٹھا دی یہ راجہ بہادر، عالی ہمت اور قدردانِ علم و فن تھا۔ بنگال فتح کرنے کے بعد کم و بیش سارے ہندوستان کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ نیپال پر حملہ کر کے اس کی فوج دلدل میں پھنس گئی۔ راجہ نیپال نے اس کو گرفتار کر لیا۔ مگر راجہ کی بہادری اور اعلیٰ تدبر نے اس کو قید سے چھڑا دیا اور مٹھی بھر فوج کی مدد سے نیپال پر قبضہ کر لیا اور نیپال کے راجہ کو قیدی بنا کر کشمیر لے آیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ بعد میں یہ راجہ بڑا ظالم بن گیا اور اپنی رعایا کو قتل کرنے کا اعلان کر دیا۔ مشہور ہے کہ پرگنہ کامراج میں اس کو تانبے کی ایک کان ملی۔ اس تانبے پر اس نے اپنا سکہ مضروب کرایا اور چند

ہمارا ادب

مواضعات بھی آباد کیئے۔

پنجاب اور ہندوستان کے بعض علاقے محمود غزنوی کے حملوں کے شکار ہوگئے

محمود کی فوج بخارا، سمرقند اور افغانستان کے سپاہیوں پر مشتمل تھی۔ جب یہ فوج ظفر موج غزنی سے باہر کوچ کر گئی تو ہندوستان میں بھونچال پیدا ہوا۔ اجمیر۔ دہلی۔ قنوج اور لاہور کے راجوں نے محمود کی مزاحمت کی۔ مگر محمود کی فوج کے سامنے یہ سب راجے بے بس ثابت ہوئے اور یہ سب علاقہ محمود نے نہایت ہی آسانی کے ساتھ فتح کر لیا۔ محمود نے ہندوستان پر سترہ حملے کئے اور پندرہ حملوں میں وہ کامیاب ہوگیا۔ دو حملوں میں ناکام رہا۔ یہ دونوں حملے محمود نے کشمیر پر کئے تھے۔ محمود کا گیارواں حملہ کشمیر پر سنہ ۱۰۱۵ء میں ہوا تھا۔ اس وقت کشمیر کی حکمران ایک ہندو خاتون دیدہ رانی تھی۔ محمود کو اس حملے میں سخت نقصان اٹھانا پڑا اور اکثر فوج ہلاک ہوگئی۔ چنانچہ محمود نے اس مہم کو ناتمام چھوڑ کر غزنی کی راہ لی۔ اگرچہ مورخوں نے محمود کی ناکامی کے اسباب بیان نہیں کئے ہیں۔ محمود لوکوٹ (لوہر کوٹ) کے قلعے تک آپہنچا۔ محمود نے قلعے کا محاصرہ کیا۔ مگر قلعے کو فتح کرنے میں کامیاب نہ ہوا اور بے نیل و مرام لوٹا۔ محمود کو پہلی بار اس قسم کا معرکہ درپیش آیا تھا۔[1]

کیا مسٹر ریوز (REV) کینن (CANON) اور بیسکو (BISCOE) بتا سکتے ہیں کہ پنجاب اور شمالی ہندوستان کے برعکس کشمیریوں نے دنیائے عظیم فاتح محمود غزنوی کی فوجوں کا کس طرح مقابلہ کر کے محمود کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔ محمود نے دوسری بار بھی کشمیر پر حملہ کر کے قسمت آزمائی کی۔ یہ حملہ محمود نے ۱۰۲۱ء میں کیا۔ مگر دوسری بار بھی محمود کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اور ہمیشہ کے لئے کشمیر فتح کرنے کا خیال چھوڑ دیا۔ اور بجائے کشمیر کے پنجاب میں اپنی حکومت قائم کر لی۔ اور پنجاب ۱۱۸۶ء تک غزنی کا ایک حصہ رہا۔ ڈریو۔ فوسٹر۔ مور کرافٹ اور ہیگل اگر حقائق کا جائزہ لیتے تو انہیں اچھی طرح معلوم ہو جاتا کہ ایک کمزور بزدل قوم محمود جیسے فاتح کا مقابلہ کرنے میں کیسے کامیاب ہوئی تھی۔ لہٰذا حقائق کی روشنی میں ان سب یورپین سیاحوں کی رائے ناقص اور بے بنیاد ثابت ہو رہی ہے

---

[1] نگارستان کشمیر۔ [2] رنجیت سیتارام جلد چہارم صفحہ ۱۶۶ — ۱۶۹ ہمارا ادب۔

کشمیر ۱۳۳۹ء میں مسلمانوں کے تسلط میں آیا۔ کشمیر کے مسلمان بیرونی ممالک سے یہاں نہیں آئے وہ ہندو۔ بدھ اور جین مذاہب کو چھوڑ کر مسلمان ہو گئے ہیں۔ اور بہ حیثیت کشمیری کشمیر میں بود و باش اختیار کر لی۔ مسلمان سلاطین کشمیر میں سلطان شہاب الدین کا نام فتوحات کے سلسلے میں کافی روشن ہے۔ وہ عظیم فاتح اور بہادر سپاہی تھا کشمیر کی محبت کا جذبہ اس کے رگ و پے میں ساری و جاری تھا۔ فوجی طاقت اور نظم و نسق کے لحاظ سے اس کا نام دنیا کے مشہور بادشاہوں میں شمار ہوتا ہے۔ سکندر اعظم کی طرح دنیا اس کی فتوحات کے سامنے بہت تنگ تھی۔ وہ اس دن کو اپنے میں شمار نہ کرتا جس روز کسی شہر یا علاقے کے فتح کرنے کی خبر اس کو نہ ملتی تھی۔ غزنی۔ کابل اور قندھار کے حکمران اس سے خائف رہتے تھے۔ اس کے عہد حکومت میں سلطنت کشمیر اپنے انتہائی عروج کو پہنچ چکی تھی۔ کشمیر کے علاوہ لداخ۔ گلگت۔ کافرستان۔ تبت۔ بلتستان۔ کاشغر۔ کابل۔ پشاور اور پنجاب یہ سب علاقے اس کے زیر نگین تھے[1]۔ مشہور مورخ جونا راج لکھتا ہے۔

"کہ نہ وہ آہو چشم عورتوں کی طرف ملتفت ہوتا تھا۔ نہ شب ماہتاب میں موسیقی اور شراب کی محفلیں منعقد کرتا تھا۔ ہر وقت فوج کشی اور تسخیر ممالک میں منہمک رہتا تھا"[2]

اس کے ہندو وزیر اودے چاری نے ایک مرتبہ یہ تجویز پیش کی کہ گوتم بدھ کے برنجی مجسمہ کو پگھلا کر ہزاروں روپے کی مالیت کے سکے ڈھالے جا سکتے ہیں۔ مگر اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ یہ بات اس کے وقار کے خلاف ہو گی۔

کشمیر میں تعلیم کی اشاعت اور فنون لطیفہ کی ترویج میں سلطان شہاب الدین نے ذاتی دلچسپی لی۔ مکاتیب اور مدارس کھولے۔ کشمیر کے اکثر علاقوں کو آباد کیا۔ وہ خود عالم تھا۔ اور علم و فن کی آبیاری کرنے میں کبھی کوتاہی سے کام نہ لیا تھا۔ عدل و

---

[1] کشمیر سلاطین کے عہد میں۔ مترجم جناب علی حماد عباسی صاحب ایم اے استاد شعبۂ انگریزی شبلی نیشنل کالج اعظم گڑھ

[2] شرح "جاوید نامہ" پروفیسر یوسف سلیم چشتی صفحہ ۱۳۳۲، عشرت پبلیشنگ ہاؤس انارکلی لاہور ہمارا ادب۔

انصاف اور مساوات کا علم بردار تھا۔

جونا راج اس بادشاہ کی تعریف دل کھول کر کرتا ہے۔ ان کے دور میں حضرت سید علی ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ کشمیر میں تشریف لائے۔ جونا راج لکھتا ہے کہ سلطان نے ایک بھاری لشکر لے کر دہلی پر یورش کی۔ مگر حضرت سید علی ہمدانی کے بیچ بچاؤ سے لڑائی صلح میں مبدل ہو گئی۔ تاہم سلطان مذکور کا پلہ ہی لڑائی میں بھاری تھا۔ اس صلح کی رو سے کشمیر سے سرہند تک کا علاقہ سلطان کو ملا۔ اور فیروز شاہ تغلق کی تین لڑکیاں سلطان کے عزیز و اقارب سے بیاہی گئیں۔ ایک سلطان کے بیٹے حسن خان سے، دوسری سلطان کے دوسرے بیٹے قطب الدین سے، تیسری سلطان کے سپہ سالار سید حسین بہادر سے۔ علامہ اقبال اس عظیم سلطان کے بارے میں فرماتے ہیں

کوہ ہائے خنگ سار او نگر
آتشین دست چنار او نگر!
در بہاران لعل می ریزد ز سنگ
خیزد از خاکش یکے طوفان رنگ!
لکہ ہائے ابر در کوہ و دمن
پنبہ پران از کمان پنبہ زن!
کوہ و دریا و غروب آفتاب
من خدا را دیدم آنجا بے حجاب!
با نسیم آوارہ بودم در نشاط
بشنو از نے می سرودم در نشاط!
مرغکے می گفت اندر شاخسار
با پشیزے می نیرزد ایں بہار
لالہ رست و نرگس شہلا دمید
باد نوروزی گریبانش درید!
عمر ہا بالید از ایں کوہ و کمر
نستر از نور قمر پاکیزہ تر!

عمرہا گل رخت بربست و کشاد
خاک ما دیگر شہاب الدین نزاد[۱]

قدرت نے کشمیری قوم کو ہر قسم کی نعمتیں عطا کی ہیں۔ یہاں کی آب و ہوا خوشگوار اور معتدل ہے۔ موسم بہار میں ہمارا کشمیر گلزار ارم بن جاتا ہے۔ اس کی مٹی زعفران پیدا کرتی ہے۔ اور یہاں کے مناظر اتنے دل کش، حسین و جمیل ہیں کہ انہیں دیکھ کر خدا یاد آجاتا ہے۔

۱۔ "جاوید نامہ" — اقبال، مطبوعہ لاہور ـ صفحہ ۱۸۸

ڈاکٹر مِتھلیش سوامی

معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا

● عورت صرف ماں ہی نہیں اُس کے کئی رُوپ اور بھی ہیں۔ وہ ماں کے علاوہ بہن ہے، بیٹی ہے، بیوی ہے اور نہ جانے عورت کے رُوپ میں مرد کے ساتھ اُس کے اور کتنے رشتے ہیں۔ بیٹی بن کر وہ باپ اور بھائیوں کا پیار حاصل کرتی ہے اور ایک قرض وصول کرنے والے ساہوکار کی طرح جب وہ اپنا قرض وصول کرتی ہے تو کسی اور آنگن میں جا کر اپنا گھر بساتی ہے۔ جہاں وہ اپنی تمام خوشیوں کو نئے پریوار کی مسرتوں میں تلاش کرتی ہے۔ بہن بن کر وہ بھائی کو راکھی باندھتی ہے۔ اس میں بھائی کو ہر بلا سے محفوظ رکھنے کی دُعا شامل ہوتی ہے اور مصیبت کے وقت بھائی سے امداد کا قول حاصل کرنا ہوتا ہے۔ بیوی بن کر وہ اپنے شوہر کو سب کچھ سونپ دیتی ہے اور اس طرح سے یک جان دو قالب کی ضرب المثل کو زندہ رکھتی ہے۔ وہ مریم بھی ہے کوشلیا بھی اور آمنہ بھی۔

اس مجسمہ مہر و وفا پر اُس کے بطن سے جنم لینے والوں نے ناقابل برداشت طعن و تشنیع بھی کی ہے۔ اسے فریب، دھوکہ اور مکر کا نام بھی دیا ہے۔ مگر اس شاخِ گُل نے اپنی مہک نہیں چھوڑی۔ جبکہ مہاکوی تُلسی داس نے یہاں تک کہا کہ ؎

ڈھول، گنوار، شُودر، پشو، ناری

یہ سب تاڑن کے ادھیکاری

مگر تُلسی داس جی کے کچھ پیروکار ایسے بھی ہیں جو اس دوہے کو اپنا مطلب پہنا دیتے ہیں۔

ہیں۔ بہرحال یہ رائے کا معاملہ ہے۔ خصوصاً نظریاتی بات ہے۔ اس سے نظریاتی بات چیت میں بحث کا کوئی پہلو نہیں نکلنا چاہیئے۔

ایک تلسی داس جی پر کیا موقوف ہے۔ کئی دیگر عالموں اور مفکروں نے تو عورت کو سراسر فریب کہنے میں بھی کوئی جھجھک محسوس نہیں کی۔ کچھ ایک نے تو زر، زمین کے ساتھ زن یعنی عورت کو بھی فساد کی جڑ قرار دیا ہے۔ اور پھر تاریخ عالم میں جہاں عورت کی بے مثال قربانیوں اور ایثار کا ذکر آتا ہے وہاں اس کے سبب کئی سلطنتیں تباہ ہونے کا حال بھی درج ہے۔

عورت کی مردوں نے جہاں پرستش کی ہے وہاں اس پر بے پناہ ستم بھی توڑے ہیں اور اسے مردوں کی زندگی کے لئے لعنت بھی قرار دیا ہے۔ کچھ ایک نے یہ بھی کہا ہے کہ دھرتی اور عورت میں یہی بات مشترک ہے کہ ان میں بے پناہ قوت برداشت ہے اور اس باعث وہ ہر ستم اور ہر ظلم کے خلاف جو ان پر توڑا جاتا ہے، لب کشائی بھی نہیں کرتیں۔

مگر ایسا وقت بھی آیا ہے۔ جب بے پناہ برداشت کی قوت رکھنے کے باوجود عورت نے انتقام لینے کا فیصلہ کیا ہے۔ وہ جب نسوانیت پر لگائی گئی کراری چوٹ کو برداشت نہ کر سکی تو اس نے چراغ خانہ بنے رہنے کی نسبت چراغ محفل بننا مناسب سمجھا۔ نت نئی رنگینیوں کے متلاشی مردوں کو اپنے دام میں گرفتار کر کے انتقام لیا۔ اور اس صورت میں اس نے یہ کہہ کر صفائی پیش کی کہ چندن کو زیادہ دیر گھسا جائے تو وہ آگ اگلنے لگ جاتا ہے۔ اور یہ حقیقت بھی ہے کہ مہر و وفا کی پیکر، عورت۔ جب انتقام لینے پر آئی تو اس نے بادشاہوں کی بادشاہت کو خاکستر بنا دیا اور اس خاک کے تودے پر کھڑے ہو کر دیوانہ وار قہقہے لگائے۔

کچھ دانشوروں کا یہ کہنا ہے کہ عورت فطرتاً انتہا پسند ہے۔ اسے درمیانی راستہ اختیار کرنا پسند نہیں۔ انتہائی پیار یا انتہائی نفرت۔ مگر پھر بھی اس کا طرۂ امتیاز یہ رہا ہے کہ وہ دونوں قسم کی انتہاؤں میں بھی عظیم رہی ہے اور یہی اس کی سب سے بڑی خوبی ہے۔

کچھ عیاش طبع لوگوں کا خیال ہے کہ خوبصورتی اور مہر و وفا کا یہ پیکر صرف مردوں کے جی بہلانے کی صورت ہے۔ کبیر ایک نے اُسے متلون مزاج، جذبات کے پیچھے بھاگنے والی کہہ کر بھی صبر نہیں کیا۔ بلکہ اُس کی سرشت میں بدی کے غالب عنصر کا پُرزور الفاظ میں ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ عورت جب گرتی ہے تو گرتی ہی چلی جاتی ہے تحت الثریٰ تک۔ راستے میں وہ کہیں کبھی نہیں ٹھہرتی، ٹھہر بھی نہیں سکتی۔

لیکن ایسا بھی تو ہوا ہے کہ اخلاقی بلندیوں پر کھڑی عورت جب اتفاقاً گرنے لگی ہے تو غیب کی کسی صدا نے اُس کے پیر مضبوطی سے ہی نہیں پکڑے بلکہ اُس کی زندگی کے دھارے کا رُخ اُن چشموں کی طرف موڑ دیا ہے جن پر ہزاروں بے مرادوں نے دل کی مُراد پائی ہے اور پاتے رہیں گے۔

وفا اور حیا کی تصویر بن کر اُس نے صفحۂ ہستی پہ اپنے پیروں کے وہ گہرے نقوش چھوڑے ہیں جن کی تلاش صدہا نسلوں کو رہی ہے اور رہے گی۔ کہیں وہ چیر نول کی ریکھا بن کر رام کے ساتھ بن باس گئی ہے اور کہیں اپنے شریکِ حیات کو طاقت بخشنے میں اپنی جان ہی دے بیٹھی۔ تلوار ہاتھ میں لے کر جہاں وہ رن چنڈی بن گئی ہے وہاں تلوار کے زور سے ہی اُس نے اپنی عصمت کی حفاظت بھی کی ہے۔ اپنے شوہر کی دائمی جدائی کو برداشت نہ کرتے ہوئے اُس نے سولہ سنگار کر کے خود کو چِتا کے بھیانک شعلوں کے سپرد کر دیا اور جدائی کی آگ سے چِتا کی آگ کو ٹھنڈا اور راحت بخش تصوّر کیا۔ مگر اِن تمام باتوں کے باوصف ایسے لوگ بھی ہیں جنہوں نے عورت کے بارے میں کہا ہے ؎

بجز بے وفائی کچھ نہیں اِن کے وجود میں
رگ رگ میں ہے فریب، دغا بال بال میں

عورتوں کی بے وفائی کے قصّے بیان کرنے والوں نے اپنے اپنے اندازِ بیان کو موثر بنانے کی پوری کوشش کی اور اس سلسلہ میں خود کو برحق ثابت کرنے کے لئے کہا ہے کہ عورت اگر رام، کرشن، حضرت محمد صاحب، نانک، عیسےٰ مسیح چشتی، گورو گوبند سنگھ، گوتم، ٹیگور، گاندھی، سبھاش اور جواہر کو جنم دینے والی

ہے تو اُس نے راون، کنس، یزید، ہلاکو، چنگیز خان اور ہٹلر وغیرہ کو بھی جنم دیا ہے
مرد جس شدت سے عورت کی طرف مائل ہوتا ہے اگر اُسی شدت کے ساتھ اُس کا ذہن
دوسری طرف مائل ہوتا تو اس نے کب کا کائنات کو فتح کر لیا ہوتا ـــ عورت وہ بلا ہے
جس سے مرد کو قوت نصیب نہیں ہوتی بلکہ وہ ہر لمحہ اُس کے سامنے اپنی قوت زائل کرتا ہے۔
عورت ایک اُلجھن ہے۔ ایک عمر قید۔ جس سے مرد کو زندگی بھر نجات حاصل نہیں ہوتی۔
ایک منچلے شاعر نے تو یہاں تک نصیحت سی بھی فرمائی ہے۔

دُور اس الجھن سے لاکھوں کوس رہنا چاہیئے
لفظ عورت کو جہاں میں قید کہنا چاہیئے

مگر ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ زندگی کے اس گلستان سب مردوں کی
زندگی جو گوناگوں دلچسپیوں اور دلآویزیوں سے بھری ہے اُس کا سبب اور اُس کی وجہ
بھی تو عورت ہی ہے ؎

صد رنگ جس چمن میں مردوں کی زندگی ہے
عورت اُس چمن کی رنگین تیتری ہے

ظاہر ہے کہ چمن کی خوبصورتی جہاں رنگارنگ پھولوں سے سنورتی ہے۔ وہاں رنگیں
تیتریوں کا وجود اس میں اور بھی دلکشی پیدا کرتا ہے۔

جس نے عورت کو جس بھی رنگ میں دیکھا ہے اُس نے اُسے اُسی
نام سے یاد کیا ہے۔ اور ان ناموں میں برابر اضافہ ہوتا جا رہا ہے شاید رہتی دنیا
تک ہوتا ہی رہے گا۔ کیوں کہ یہ وقت کی بدلتی ہوئی اقدار اور زاویہ ہائے نظر کی
تبدیلی ہے اور تبدیلی ہی منشائے فطرت ہے۔

یوں بھی مشرقی عورت ایک عالم میں اپنی گوناگوں خوبیوں اور لطافتوں
کی بدولت مشہور رہی ہے اور وفا پرستی اس کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔ جب بھی مشرق
کے علاوہ دنیا کے کسی ملک میں عورت نے وفا یا ایثار کی مثال قائم کی ہے تو اُسے اہل دنیا
نے مشرقی عورت کی تقلید ہی قرار دیا ہے اور ایسا کرتے وقت اُس کا سر بے ساختہ
طور پر مشرقی عورت کے قدموں میں جھک گیا ہے۔

مشاہدہ ہے کہ وقت کی جابر قوتیں اپنی استمانہ روی اور تغافل شعاری کے باوجود تبدیلیوں کی خواہاں رہی ہیں، اور زمانے کے نشیب و فراز سے بلاواسطہ یا بالواسطہ وہ بھی بدلتی جاتی ہیں۔ وہ لوگ جو عورت کو خدا کے بعد کا درجہ دیتے ہیں اور اس کی وفا پرستی اور ایثار کے گن گاتے نہیں تھکتے، اپنے ان کرمفرماؤں کے سامنے اُس وقت مبہوت ہو جاتے ہیں جب یہ سنتے یا اخباروں میں پڑھتے ہیں کہ فلاں عورت نے یہ گل کھلائے یا یہ مذموم حرکت کی۔

ایسے اوقات میں اُن لوگوں کی زبانیں زیادہ تیزی سے چلتی ہیں جو عورت کو مکر و فریب یا ریاکاری کا مجسمہ سمجھتے ہیں۔ وہ عورت کو دُنیا بھر کی لعنت ثابت کرنے میں زمین اور آسمان کے قلابے ملانے لگتے ہیں۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب کسی محفل میں عورت کی بے وفائی یا وفا پرستی پر بحث چھڑ جاتی ہے اور طرفین اپنے اپنے نظریئے کو صحیح ثابت کرنے کے لئے عشق کی داستانوں کے لامتناہی سلسلے شروع کر دیتے ہیں تو وہ تھک ہار کر خاموش ہو جانے ہی میں بہتری سمجھتے ہیں۔

کچھ دانشوروں کو یہ کہتے بھی سنا جاتا ہے کہ عورت کا وجود ایک ایسے منظر کی طرح ہے جس میں کوئی دلکشی کوئی دلفریبی نہیں ہوتی۔ البتہ انسان کا اپنا ذوقِ نظر اور حصولِ مقصد کی تشنہ لبی ہی منظر میں جاذبیت پیدا کر دیتی ہے یا خوش آیند آرزوؤں کا ذکر ہی اسے دلفریب بنا دیتا ہے۔ اس قسم کے ایک دانشور نے کہا ہے ؎

تجھے حسین بنایا ہماری نظروں نے
یہ ہمارا حسنِ نظر ہے، ترا شباب نہیں

مگر اس نظریہ کا ہر شخص قائل ہو یہ بات بھی نہیں ہے۔ کوئی اور دوسرا ایسے موقع پہ یوں بھی بول اٹھتا ہے۔ کہ شاخِ گل کی لچک، بہار آفرینی اور سدا بہار مہک کو جو تسلیم نہیں کرتا اُس کے سینے میں پتھر تو ہو سکتا ہے مگر دل نہیں۔ کیوں کہ حُسن ہے اور فطرت کے وجود سے انکار کفر ہے۔ فطرت نے ...... کے خوبصورت وجود کی لافانی تخلیق ......

بہر حال جس آنکھ نے جس ......

ہمارا ادب

سے قدرت کے اس لافانی شاہکار "عورت" کو دیکھا، اُس نے ویسا ہی بیان کیا۔ عورت شاخِ گل بھی ہے اور تلوار بھی ہے۔ اور اگر ہر زاویہ نظر کی بحث سے پہلو تہی منظور ہو تو یہ کہنا پڑتا ہے کہ عورت ——

معمّہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا ——!

تمناؤں نے دم توڑا ہے باقی صرف حسرت ہے
میں پھر بھی جی رہا ہوں زندگی! یہ کیا مصیبت ہے

زمانے سے شکایت میں کروں کیسے محبت کی
زمانے کو محبت سے تو خود بھی اک شکایت ہے

بھرے ساگر کو جب بھی دیکھتا ہوں سوچتا ہوں میں
ہے ساحل آج تک تشنہ دہن یہ کیا قیامت ہے

ترے میخانے کی زینت ہے اب بھی شور و غل ساقی
کہ اب بھی تشنہ دہنوں پر تری چشمِ عنایت ہے

میں جب تک اُن کے سنگِ در سے وابستہ ہوں اے پریمی
ستم ہی وہ کریں مجھ پر تو میں سمجھوں عنایت ہے

پریمی رومانی

منظومات

غلام محمد آجر

کالا تابوت

دوستو!

یہاں

آئے تھے

چند روز ہوئے

چند ماہرینِ آثارِ قدیمہ نے کھدائی کی تھی

اس جگہ

چٹانوں کے سینے میں گہرا

گمشدہ لمحات کا اک غار نمودار ہوا

جس سے اک کالا تابوت ابھر آیا

وقت کی کیلوں سے بڑی مضبوطی کے ساتھ

بند

تابوت کو کھولا تو اس میں سے

اک سلگتے ہوئے سورج کا پنجر نکلا

اور آخر یہ ماہرین نے یہ اعلان کیا

"کہ انسان نے

بڑی مدت ہوئی اس سورج کو

زندہ ہی سینے کے غار میں دفنایا تھا"

نشاط کشتواڑی

پریم نگری

کٹھن کا یہ بسیرا ہے
زمانے میں اندھیرا ہے
یہاں نفرت کا ڈیرا ہے
ارادہ اب یہ میرا ہے

کہ جاؤں پریم نگری کو
بساؤں پریم نگری کو

یہاں نفرت بھرا ہر تن
ہے بھائی بھائی کا دشمن
کہاں پھولے پھلے گلشن
پکارے ہے مرا جیون

کہ جاؤں پریم نگری کو
بساؤں پریم نگری کو

یہاں اک حشر ہے برپا
چھری ہے ہاتھ میں ہر جا
کہاں کا خوف ڈر کس کا؟
دکھی کا دل ہے یہ کہتا

ہمارا ادب

کہ جاؤں پریم نگری کو
بساؤں پریم نگری کو

لٹیروں کا یہ مندر ہے
فریب و مکر کا گھر ہے
خدا ان کا بُت زر ہے
یہ اب میری زباں پر ہے

کہ جاؤں پریم نگری کو
بساؤں پریم نگری کو

جہاں وہ پریم نگری ہے
وہ بستی پریمیوں کی ہے
مگن اس میں ہے جو بھی ہے
یہ میری روح کہتی ہے

کہ جاؤں پریم نگری کو
بساؤں پریم نگری کو

وہیں انصاف بستا ہے
وہیں پر رحم سستا ہے
وہی منزل کا رستہ ہے
مرا دل بھی ترستا ہے

کہ جاؤں پریم نگری کو
بساؤں پریم نگری کو

وہ ایسی شانت نگری ہے
جو قسمت ہی سے ملتی ہے
ضرورت جسکو اسکی ہے
اسی کی آرزو بھی ہے

کہ جاؤں پریم نگری کو
بساؤں پریم نگری کو

گردِ سفر

جب سے میں شہرِ نگاراں سے چلا آیا ہوں

مہرباں مجھ پہ زمانہ کبھی عنواں نہ ہوا
میں کبھی زینتِ آغوشِ بہاراں نہ ہوا
کوئی بھی جلوہ نگاہوں میں نمایاں نہ ہوا

جب سے میں گلشنِ خنداں سے چلا آیا ہوں

اور ہی رنگ میں ہیں لیل و نہارِ ہستی
دور ہی دور رہی نظروں سے خمارِ ہستی
اب تو اک خواب ہیں یہ نقش و نگارِ ہستی

جب سے میں منزلِ جاناں سے چلا آیا ہوں

رنج و غم، درد و الم سے میرا یارانہ ہے
[illegible] گردش [illegible] ہے

خون آلود میری زیست کا افسانہ ہے

جب سے میں جنتِ شاداں سے چلا آیا ہوں

خشک اک پیڑ سرِ راہ گزر ہو جیسے
رقص ظلمات میں اک پیشِ نظر ہو جیسے
زندگی اپنی بھی اب گردِ سفر ہو جیسے

جب سے میں شہرِ نگاراں سے چلا آیا ہوں!
جب سے میں جنتِ شاداں سے چلا آیا ہوں!

اشرف ساحل

واپسی

جسم کے باسیو
ایک مُدت سے تم
اپنی کھوئی ہوئی "پسلیاں" سونگھنے
وقت خوردہ "نشیبوں" کی آغوش میں
قطرہ قطرہ ٹپکتے رہے، آج تک
"چند بسرے گناہوں" کی یادداشت میں
اپنی خاطر کئی کھود ڈالے خلا ــــ
جسم کے باسیو
اپنی اپنی خلاؤں میں پھر لوٹ کر
خول در خول تم پھر سمٹ جاؤ
اور
اپنے اپنے عضو نوچ کر پھینک دو

مکھن لال کنول

فرمانِ جنوں

رات کا پچھلا پہر
دن کے ہنگاموں کو دفنائے ہوئے
غوطہ زن عالم سیاہی میں
چھپائے درد و کرب
جیسے بستر پر پڑا بیمار کوئی
موت سے تھک ہار کر
چادر میں لپیٹا
آخرت کی ملگجی پونجی لئے
رُوح کی گہرائیوں میں
وصل محبوبی کی حسرت کو سمیٹے
اِک نئے غسال کا اب
کر رہا ہے انتظار
رات کا پچھلا پہر......

o

میرے ہونٹوں پر سسکتی آہ

فرمانِ جنوں

بس یہی نوچے گی ساری تیرگی
ہونٹ چوسیں گے سیاہی چوم کر
تیرے چہرے سے کرن پھوٹے گی
ڈھل جائے گی رات
رات کا پچھلا پہر

کأشرٕ لکہٕ باتھ

(کشمیری لوک گیت)

★ پانچ حصے ★

لوک گیتوں میں کسی خاص زبان کے بولنے والوں کی زندگی کا سارا رس اور شہد جمع ہوتا ہے اور جتنی یہ بات کشمیری لوک گیتوں کے بارے میں صحیح ہے، شاید ہی کسی اور زبان کی لوک شاعری کے متعلق صحیح ہو گی۔ یہ جواہر ریزے اب تک کشمیر کی وسیع فضاؤں میں موتیوں کی طرح بکھرے پڑے تھے۔ اکاڈمی کے اہتمام سے پہلی بار ان کی شیرازہ بندی کی گئی ہے اور انہیں زیورِ طباعت سے آراستہ کیا گیا ہے۔

تفصیلات کیلئے ہمارے شعبۂ مطبوعات سے خط و کتابت کیجئے۔

عبدالرحمٰن کوندو

زندہ دلی کی بات کرو!

نئے نظام، نئی زندگی کی بات کرو

نمودِ صبح ہے اب روشنی کی بات کرو

کدورتوں کی نہیں، دوستی کی بات کرو

وفا نواز بنو، آشتی کی بات کرو

سمٹ سمٹ کے تو ہو جاؤ گے فنا اک دن

بقا جو چاہو تو دریا دلی کی بات کرو

یہ مانا لطف ہے مشکل ستم تو آسان ہے

وفا نہیں نہ سہی، برہمی کی بات کرو

اگر ہوں لاکھ مصائب تو خوف کیا کوندو

تم اہلِ دل بنو اور زندہ دلی کی بات کرو

غزلیں

جگن ناتھ آزاد

مدّت کے بعد اُن کا پیغام آ گیا
اِک تشنہ لب کے ہاتھ میں پھر جام آ گیا

اُس رات کی ندامتِ پنہاں نہ پوچھ تو
جب بے خودی میں لب پہ ترا نام آ گیا

کیسے بتاؤں اب جو ہوا کربِ رُوح کو
اکثر ترے بغیر جب آرام آ گیا

یہ دل مرا تو روزِ ازل ہی سے تھا خراب
تیری نظر پہ مُفت میں الزام آ گیا

میری زباں پہ ایک زمانے کا تھا گِلہ
ناگاہ مجھ کو دوست کا پیغام آ گیا

اے دل میں اپنی فتح کو لے کر کروں گا کیا
اِس معرکے میں تو ہی اگر کام آ گیا

رساؔ جاودانی
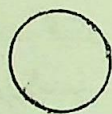
سرِ رہ کبھی ملے تھے گیا بیت اک زمانہ
جو گزر رہی ہے دل پر کہیں کس سے وہ فسانہ

نہ تھی تو نے شست باندھی کبھی ناوکِ نظر سے
یونہی تو نے تیر پھینکا مرا دل بنا نشانہ

پسِ گریہ دیدہ و دل ہوئے آنسوؤں سے خالی
جو لڑی تھی موتیوں کی گرا اُس کا دانہ دانہ

جو اُچاٹ ہو طبیعت تو چمن بھی ایک زنداں
لگے صید کا اگر دل ہے قفس بھی آشیانہ

مری گرمیٔ سخن سے ہوا جل کے راکھ حاسد
ہوئے دل سے شاد جن کا ہے مزاج منصفانہ

کبھی اے رساؔ کرم سے مرے گھر اگر وہ آئیں
کرے ناز بخت پر پھر یہ مرا غریب خانہ

حامدی کاشمیری

دشتِ ظلمت میں کہیں شعلہ بسر تھا کوئی
بھول جا، منتظرِ نورِ سحر تھا کوئی

تیر اندازوں نے گھیرا تھا اُسے، ہاں سچ ہے
کب کہا میں نے وہاں سینہ سپر تھا کوئی

رات کو کمرے میں پل بھر نہ لگی آنکھ مری
کوئی چہرہ تھا کہ سایا پسِ در تھا کوئی

خیرہ کرتی تھیں نگاہوں کو چمکتی سڑکیں
یاد کچھ کچھ ہے یہیں اپنا بھی گھر تھا کوئی

گونجی دستک کی صدا، میں نے دریچہ کھولا
سامنے تکتا ہوا راہ گزر تھا کوئی

قافلے دیکھتے دیکھتے آخرِ شب مڑ مڑ کر
گرد کے بادلوں میں خوف و خطر تھا کوئی

کہرے کے ساحلوں نے دیکھا اُسے آخر میں
جانے وہ کون تھا، آوارہ نظر تھا کوئی

رات پھولوں کی جمعیت میں ہنسی آئی بہت
کوئی تھا اشک فشاں، چاک جگر تھا کوئی

اُس نے دو بول کہے، دھوپ میں سائے پھیلے
کیسے مانوں کہ وہ انسان تھا، بشر تھا کوئی

اُس نے بیدار کیا پتھروں کو کیا کہہ کر
لوگ سچ کہتے تھے وہ شعبدہ گر تھا کوئی

نشاط کشتواڑی

کوئی ہنگامۂ محشر نہیں ہے
کوئی دل مائلِ دلبر نہیں ہے

چمن میں کیوں اندھیرا چھا گیا ہے
فلک پر کیا مہِ انور نہیں ہے

کہیں گے دل اسے کیونکر کہیں گے
کہ جو دل درد سے مضطر نہیں ہے

وفاداری کی پھر کیا قدر ہوگی
اگر کوئی جفا پرور نہیں ہے

بلوّر کو بھی دیکھا اور پرکھا
چمکتا ہے مگر گوہر نہیں ہے

پیامِ زندگی جو لے کے آیا
پیمبر کیا ہمارا رہبر نہیں ہے

درِ میخانہ ہم نے بند پایا
کوئی ساقی نہیں ساغر نہیں ہے

مرے گلشن کا جو ذرہ بھی ہوگا
وہ مہر و ماہ سے کمتر نہیں ہے

حرم والو! جسے میں پوجتا ہوں
تمہارا وہ بتِ آذر نہیں ہے

سبھی کچھ ہے مری دنیائے دوں میں
فقط وہ ایک دیدہ ور نہیں ہے

نشاطِ فکر کی جلوہ گری ہو!
تو اس سے کوئی شے بہتر نہیں ہے

منوہر لعل دل

ہم پہ بیداد تری چرخِ کہن اور سہی
یعنی اک سلسلۂ دار و رسن اور سہی

تیرے عارض کے گلابوں کی صباحت معلوم
ان میں دوشیزگیِ صبحِ چمن اور سہی

تیرے ماتھے پہ ہے تنویرِ محبت کی کرن
اس پہ تھوڑی سی کدورت کی شکن اور سہی

دل کے سب راز بتاتی ہے شکن ماتھے کی
تیرا اندازِ سخن غنچہ دہن اور سہی

شوقِ منزل نے تو رکنے کا تصور بھی نہ کر
ہمسفر رستے کی تھوڑی سی تھکن اور سہی

یہ تو پہلے ہی سے ہے کاوشِ غم سے مانوس
میرے دل میں تری یادوں کی چبھن اور سہی

اور بھی اے بتِ سفاک عنایت مجھ پر
جو دکھ اور سہی رنج و محن اور سہی

چشمِ خوں بار کی خونابہ فشانی کے سوا!
آہِ سوزاں کی تپش اور جلن اور سہی

پہلے ہی کون تھا فن کاروں کا پرساں اے دلؔ
اس نئے دور میں رسوائی فن اور سہی

قاضی غلام محمد

○
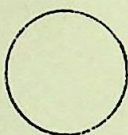
پھسلن ہے کس غضب کی خواجہ مری گلی میں
مجنوں کو کوستی ہے لیلیٰ مری گلی میں

دارا ہو یا سکندر، آفیسر ہو یا منسٹر
اُلٹا ہے سرکشوں کا تختہ مری گلی میں

نالی میں اس طرح وہ ڈوبا کہ پھر نہ ابھرا
جو سوٹ بوٹ پہنے آیا مری گلی میں

کل رات ایک صاحب آتے تھے مجھ سے ملنے
کتّوں کا بن گئے وہ لقمہ مری گلی میں

پُر سوز لے میں ظالم راتوں کو بھونکتا ہے
سہگل کا جانشین ہے کتّا مری گلی میں

ہر راہرو کے جوتے تصدیق کر رہے ہیں
چاندی مری گلی میں سونا مری گلی میں

سنگین ظلمتوں سے ٹکرا کے مڑ گئی ہیں
کرنوں کا کفر آخر ٹوٹا مری گلی میں

امر چند ولی

ہوا ہے دیدۂ دل میں چراغاں شبنمستاں کا
سرِ مژگاں لرزتے ہیں نظارہ ہے شبستاں کا

الٰہی داغِ دل کیا ہے خدا جانے جگر کیا ہے
شگوفے رازِ ہستی کے نظارہ ہے گلستاں کا

ہزاروں آرزوئیں ہیں دفن شہرِ خموشاں میں
مرا دل بجھ بجھا سا ہے دیا گورِ غریباں کا

مرے زخمِ جگر دیتے نظارہ گل ہزارہ کا
ہوتے ہیں داغِ دل روشن چراغاں ہو دلستاں کا

عدم سے بود ہے اپنی عدم اپنی حقیقت ہے
فریبِ کل جزو کیا ہے یہ اجزائے کا پریشان

سرودِ نے نکلتا ہے مرے دل سوز نالوں سے
مری رگ رگ ہوئی ہے اب ولی ریشہ نیستاں کا

شجاع سلطان
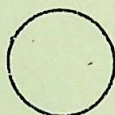
خلاء میں وحشت میں، سڑکوں پہ تیرہ سایوں میں
کہاں تلاش کریں خود کو اتنے چہروں میں

اُنہیں کہو کہ بلا اچھل پڑی ہے مقتل سے
وہ سو رہے ہیں ابھی ریت کے گھروندوں میں

ہمیں گرا دو کہ بارِ گراں نہ بن جائیں
بہت دنوں سے رکے ہیں تمہاری پلکوں میں

ہوا کچھ ایسی تھی وہ آگ بجھ گئی ورنہ
بڑا ہی لطف تھا بستی سے اُٹھتے شعلوں میں

شجاعؔ ڈر ہے کہیں آئینہ نہ بن جائے
وہ عکسِ راز جو بکھرا پڑا ہے لمحوں میں

اشرف ساحل

ہر کسی شے کے بہت ہی پاس ہوں
اب تو میں احساس ہی احساس ہوں
لے کے آیا تھا سرابوں میں کوئی
ریت میں گاڑھی گئی اک پیاس ہوں
جسم سے اب بھاگ کر جاؤں کہاں؟
میں خود اپنے جسم کا بن باس ہوں
خود سے ملنے کو زمانا ہو گیا
دھند میں بھٹکی ہوئی اک پیاس ہوں
کوئی میرا جسم کر جائے سیاہ!
منتظر میں صورت قرطاس ہوں

مرغوب بانہالی
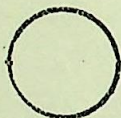
اوجِ کمال پر ہے جنونِ انتظار کا
رقصاں ہے ڈل کی موج پہ سایہ چنار کا

جادو جگا گئی ہے کسی کی نگاہِ ناز
برفاب ہے شوریدہ سرے کوہسار کا!

ہی مآل سے کہنے ہے تقاضائے التفات
بے جا نہیں ہے پھوٹنا سر آبشار کا!

مانا کہ مثلِ برق ہی آئی وہ اپنے ہاں
دیکھے کوئی شباب پہ آنا بہار کا!

مقتل پہ مرے دیر سے سرگوشیاں ہیں کیا
سمجھائے کوئی مدعا غفلت شعار کا!

گلچیں کی دستبرد کے خطرات ٹل گئے
افواہ کو ملا ہے شرف اعتبار کا!

مجھ کو یقیں ہے حشر بپا ہوگا میرے بعد
ہے دور رس اثر مرے دل کی پکار کا

خود ذکر اپنے حال کا اچھا نہیں مرغوب
حق چھینتے ہو پیرہنِ تار تار کا!

حسام الدّین بے تاب

کس طرح اے ہمنشیں! میں تیری اُلفت چھوڑ دوں
آدمی ہوں، آدمی کی کیوں محبّت چھوڑ دوں

دِل ہے پہلو میں یہ کوئی خشت و سنگ تو ہے نہیں
درد کے احساس کی میں کیسے لذّت چھوڑ دوں

دے دیا ہے مجھ کو تو فطرت نے یہ درسِ عمل
سب کی راحت کے لئے میں اپنی راحت چھوڑ دوں

ہر زخم پر آہ نِکلے اور اُن کو ہے گِلہ
دستکش وُہ ظلم سے ہوں میں شکایت چھوڑ دوں

قند کہہ دُوں زہر کو، ہو کر تمہارا ہمزباں
کیا کروں میں کس طرح بچپن کی عادت چھوڑ دوں

زندگی طوفان ہے، گرداب ہے بیتاب ہوں
جیتے جی مر جاؤں گا۔ گر اپنی ہمت چھوڑ دوں

منشور بانہالی

○
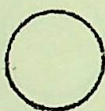
میری آہوں سے نوائے غم ہیں، قائم ہے سرور
میرے اشکوں سے ادائے گل میں کھلنے کا شعور

حسنِ کامل کی طلب، ذوقِ نگہ کی پختگی
چھین لیتا ہے سکوں دل سے، نگاہوں کا فتور

سینۂ بلبل میں قائم نہ رہا ضبطِ فغاں
جب گلستاں کی فضا میں آگیا رنگِ غرور

جستجو پیہم ہو، تو حائل نہیں ہوتا حجاب
پھول بن کر خاک سے ہوتا ہے دانے کا ظہور

رہ گزر میں ہی الجھ جاتی ہے کھو کر نقشِ پا
آگہی منزل نہیں پاتی ہے، ہو جب بے حضور

تجھ کو اے موسیٰ مسافت کی ضرورت نہ پڑی
سوزشِ دل جب فزوں تر ہو گئی از کوہِ طور

خلد سے آدم کے جانے میں بھی تھی اک مصلحت
ٹھیک ہے حضرتِ آدم کا بھی تھا اس میں قصور

بن گئی بے رقص و بربط زینتِ شب پھر، نوا
تیز تر دل کی حرارت جب ہوئی مثلِ تنور

تشنہ کامی نے مجھے منشور آوارہ کیا!
ہے بپا ہر لحظہ میرے دل میں اک یوم النشور

عبدالغفار منتو مجبور کاشمیری

○
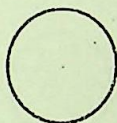
دردِ جاگا ہے دلِ بےتاب کے پہلو میں آج
اک جنوں آمادۂ پیکار ہے خو بو میں آج

وسعتِ صحرا سے بھاگا آ رہا ہے تیز تیز
ایک وحشت ہے نمایاں کیوں دلِ آہو میں آج

دید کے قابل ہے ساقی! التفاتِ دیدہ ور
اس قدر لذت ہے کیا تلخی اثر دارو میں آج

یہ بھی کثرت کا ہی اک اعجاز ہے یارو یہاں
اک تغیر سا عیاں ہے پھر دلِ یکسو میں آج

دل دھڑکتا ہے کبوتر کیوں تری آواز پر
یاس و حرماں کا اثر ہے نغمۂ یاہو میں آج

رنگ لائی ہے فغانِ نیم شب بسمل کی یوں
تیر خود قاتل کے ہے اٹکا ہوا بازو میں آج

سرد مہری کی بھی کوئی حد ہے ای اہلِ وفا
ایک یاسیت عیاں ہے محفلِ اردو میں آج

حاجتِ بوی گل و نسریں نہیں بھر شام
لالۂ خونیں کے جتنا پھول دستبو میں آج

زہرِ غم مجبور کو پینا پڑا ہے کل تلک
بس رہا ہے وہ بھی نا معلوم سی خوشبو میں آج

شہباز راجوری

چھوڑ دے ساحل اور پتوار
دیکھ لے ہے کیا یہ منجدھار
آس کا پنچھی کہاں اُڑے
شاخ و شجر ہیں سب نادار
اُڑتا ہوں ہر خواب کے ساتھ
بس کی بات نہیں رفتار
شبنم شعلے کانٹے پھول
تاویلوں کا بوجھ اتار
درد کی کرچیں اور بھی چن
جسم ہیں خوابوں کے بیکار
سازش۔ سازش ساری رات
کچھ لمحے بیدار گزار
شعر و سخن شہباز کہاں
دوشِ ہوا کے نقش آثار

رفیق راز
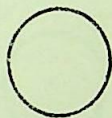
یا اُداس آنکھوں میں بادلوں کا لشکر ہے
یا ہمارے دل ہی کا آئینہ مکدر ہے
شکل سے ہے دیوانہ، چال سے ہے مستانہ
پتھروں کی بارش ہے اور وہ کھلے سر ہے
چاندنی تو سڑکوں پر بال کھولے سوئی ہے
رات کی سیاہی سب میرے گھر کے اندر ہے
یا مہیب منظروں کو چاٹنا نہیں آتا
یا وجود میرا ہی کھنڈروں کا منظر ہے
کیا لپٹ گیا مجھ سے رنج زدہ خلاؤں میں
تم تو ہو نہیں سکتی پیکروں کی چادر ہے
راز تیرے مٹ مٹ کردہ ابھرنے کا منتظر
ان اداس نظروں میں پھر آگا کہ محشر ہے

غ۔ م۔ تسنیم

جب سے اسیرِ زلف گرہ گیر ہو گئے
ہم تو کتابِ شوق کی تفسیر ہو گئے
اللہ رے برہمی وہ تمہارے مزاج کی
تم تو بگڑ کے اور بھی تصویر ہو گئے
سلجھانے چاہیں گیسوئے تقدیر جس قدر
اتنے ہی کند ناخنِ تدبیر ہو گئے
رنگِ حیا سے جن کے سنواری عروسِ فکر
وہ بھی خدائے شوخیِ تحریر ہو گئے
تسنیم شامِ غم کے اندھیرے مٹا گئے
جب سے وہ میرے خواب کی تعبیر ہو گئے

اقبال فہیم
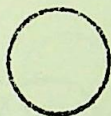
مری نگاہ میں تو اضطراب باقی ہے
کبھو بھی زندگی کی آب و تاب باقی ہے
کہ کائنات کے دل کی کتاب باقی ہے
جدا جدا ہے حقیقت سراب باقی ہے
حقیقتوں کا مری مجھکو دا سطہ تو نہ دے
قریب شمس و قمر بھی جواب باقی ہے
ترے خیال میں کیا کیا نہ ہم پہ گزری ہے
تڑپ رہی ہے سحر اجتناب باقی ہے
بہ قدر شوق متیسر جنوں اے ناخن
پتہ ہے شیشہ مکا نو شباب باقی ہے
ہماری ذات مقید ہے مشغلہ اپنا
کریدتے ہو نزاکت سراب باقی ہے
گلوں کی گود میں ترک وفا کا وعدہ کیا
بپھر اٹھی ہے قیامت عذاب باقی ہے
فہیم خود سے ملو بھی کبھی کبھار ملو
تلاش میں ہے زمانہ نقاب باقی ہے

محمد فاروق مضطر

○

یوں حجرۂ خیال میں بیٹھا ہوا ہوں میں
گویا مرا وجود نہیں واہمہ ہوں میں

گھر میں بھی بکھر چلا ہے سمندر سکوت کا
بے چارگی کی چھت پہ کھڑا چیختا ہوں میں

دیکھو مری جبیں پہ مرے عہد کے نقوش
رکھو مجھے سنبھال کے اک آئینہ ہوں میں

اب تک شب قیام کا اک سلسلہ بھی تھا
اب آفتاب بن کے سفر پہ چلا ہوں میں

خود سے تو روشناس ابھی تک نہ ہو سکا
یہ اتفاق ہے کہ جو تم سے ملا ہوں میں

فاروق مضطر
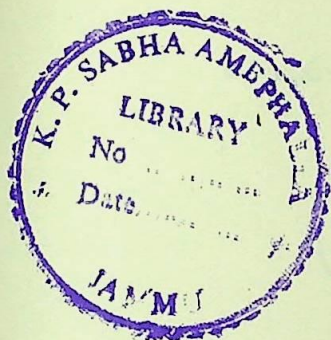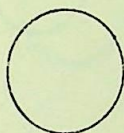
روز ان اُونچی چھتوں کو غور سے دیکھا کریں
اپنے بونے پن کو آؤ اور بھی بونا کریں!!
ٹھوکریں کھا کھا کے اس منزل میں اور اب کیا کریں
آئینوں سے اپنے چہروں کا پتہ پوچھا کریں
ہر نئے چہرے کی خاطر دو قدم ٹھہرا کریں
جب کتابوں کو پڑھا جائے تو پھر سوچا کریں
اُلجھنیں، فکر و تردد، اضطراب — آوارگی
ایک دو لمحوں تو اپنے آپ میں ٹھہرا کریں
دن کے ہنگاموں نے خود سے بے خبر رکھا ہمیں
شام جب آئے تو گویا خواب سے چونکا کریں
وقت سے پہلے نہ ہو جائیں حوادث کا شکار
آنے والے زرد لمحوں کو نہ یوں سوچا کریں
آؤ مضطرؔ اجنبی لوگوں کو چاہیں ٹوٹ کر
شہر تنہا ہو گیا ہے محفلیں برپا کریں

نورالحق نسیم

ہزار رنج و الم درمیاں ہیں ہمدم
ہزار جہدِ مسلسل سے زندگی ابھری

عجیب بات ہوئی حادثوں کے درپردہ
یہ دم بدم ہی کے احساس سے چھری ابھری

یہ سوچ و فکر کی بستی کے گھر نرالے ہیں
تمام شہر میں جھانکا تو اک گلی ابھری

وہ اپنے وہم میں رشتوں سے کٹ گیا ہے
یہ کن حروفِ تمنا سے بے بسی ابھری

ہمارے شہر میں اک آگ سی دہکتی ہے
عجیب راہ مرے ذہن سے رتیلی ابھری

مجھے نگل نہ لے کہیں وہ آتشیں پیکر
میرے ہی جبۂ رگ رگ سے تشنگی ابھری

نہ جانے اجنبی راہوں سے کس جگہ آیا
یہاں کے اجنبی لوگوں سے بے کسی ابھری

ایم وحید عاصمی

○

محبت ہو نہ ہو آنکھوں کا جھکنا ہی مروّت ہے
کہ الفت کا تلاطم ہو، یہی دنیا کی حسرت ہے

قیامت تھی، زینت تھی وہ آنکھوں سے عیاں کیوں تھی
یہی حسنِ تصوّر تھا جو اُن زلفوں کی وحشت ہے

کبھی حسرت جو تھی میری پھر آئی زندہ بن کر وہ
رلاتی ہے جو راتوں کو وہی میری زینت ہے

مچلتی ہے، تڑپتی ہے، چراغِ دل جلا کے وہ
حقیقت میں مری ہستی سلگنے کی ہی صورت ہے

بدن کا رنگ نیلا ہو کے دنیا پر ہیں چھا جاتا
شبِ فرقت میں وہ ناگن اگر ڈستی یہ حسرت ہے

سنہری گیسوؤں سے جی لگا کے اپنا پی جاؤں
مرا دن کبھی بھیانک رات بن جائے کہ زینت ہے

افسانے

ٹھاکر پونچھی

بند کھڑکی کی روشنی

شکنتلا اب کھڑکی کے آئینے میں اپنی محبت کا انتظار نہیں کر رہی اور ٹوٹا پھوٹا چاند اب اور دُور ہو گیا ہے۔ سوچوں کے سپنوں سے بھی دُور۔ اب صرف جھروکوں کی آنکھیں ہیں۔ انتظار کی خرابیں ہیں اور بے رس کہانیوں کی اُداسیاں اور یہ یادوں کے کبھی نہ ختم ہونے والے فاصلے۔ روح، جسم اور بے رس سانسیں اور چاروں طرف دھند۔ کبھی چاندنی راتوں کے اندھیروں کی۔ کبھی یادوں کی کسمساہٹ کی۔ کبھی شہنائیوں کی سرگوشیوں کی اور یہ دھند کاش کہ شکنتلا کے پیار کا دامن بن جاتی۔ اُس کے ملن کی اُمید بن جاتی۔ اُس کی تھکی ہاری دھڑکنوں کی رات بن جاتی۔ اُس کی بھٹکی ہوئی روح کا سکون بن جاتی اور وہ آج ایک اُجڑے ویران دوراہے پر کھڑی اپنے جیون کی شانتی کی بھیک نہ مانگتی۔

پہلے جیون کے ہنگاموں کی تلاش
بعد میں جیون کی شانتی کی جستجو!

لیکن شکنتلا اب جیون کی شانتی تمہاری جھولی میں کیسے ڈالی جائے۔ تمہارے خوبصورت انگ کی کون سی شفرک سے سوچ کی ابتدا کی جائے۔ من کی کون سی کھڑکی کھولی جائے۔ ہاں، اتنی سی بات ضرور ہے کہ تمہاری حسین ترین جوانی میرے سامنے جاگی۔ بنی سنوری بھی میری نگاہوں کے سامنے ہی۔ یہ بھی سچ ہے کہ جب تم نے عمر کے آئینے میں پہلی بار انگڑائی لیتا ہوا اپنا بھرپور گداز جسم دیکھا تھا تب بھی میری آنکھیں تمہیں جھانک رہی تھیں اور میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں تم سے التجا کی تھی ــــ میں نے معصوم پھولوں کی خوشبو کو مرتے دیکھا ہے، تم نہ مرنے دینا اور تم نے آنکھوں ہی آنکھوں میں جواب دیا تھا ــــ یہ تمہاری ادھیڑ عمر کی جا رہا ادب

سوچ ہے۔ جو اپنی ہر چیز سمیٹتی پھرتی ہے۔ میری عمر کی سوچ نہیں ہے جو ہر چیز لٹانے کی قائل ہوتی ہے اور میری تمہاری دوری میں بھی کتنا قرب تھا!

جب کبھی بیچ کا فاصلہ ہٹ جاتا۔ میں اپنے دل کی آواز تم تک پہنچاتا۔ لیکن تم سنی ان سنی کر دیتیں۔ ایک ایسے ہی لمحے میں، میں نے کہا تھا ـــــ جوانی کا آنچل اپنے ہاتھوں میں لہرانا بند کر دو کہ تمہارے نازک ہاتھ اب کانپنے لگے ہیں اور جذبات کی آندھی منہ زور ہوتی جا رہی ہے۔ کہیں یہ آنچل تمہیں اڑا کر کسی انجانی فضا میں نہ لے جائے۔ لیکن تمہارا جواب وہی تھا۔ ـــــ یہ عمر کے دل کا لرزہ نہیں۔ کنواری ہواؤں کا سرسرانا ہے۔ جو جانی پہچانی فضاؤں کی دین ہوتی ہے۔

ایک عمر کا ٹکراؤ۔

ایک وقت کا تقاضہ ـــ!

لیکن ایک خاص عمر کی دھڑکنوں کے بعد۔ تم کون روک سکا اور پھر ان لمحاتی جذباتی حادثوں کی تکمیل، ایک عام سی گلی کوچوں کی کہانی۔ جس کی ابتدا تو بڑی حسین اور جاذب ہوتی ہے۔ لیکن اختتام بڑا گھناؤنا ـــ اب یہی کہنا پڑے گا نا کہ ایک طرف جھوٹ تھا، ہوس تھی۔ لیکن دماغ کا پیار تھا۔ جس میں اچھی بری سوچ کا دخل ہوتا ہے۔ اور دوسری طرف مجبوری تھی، معصومیت تھی اور صرف دل کا بے ہنگم پیار تھا۔ دل کو تنہا چھوڑ دیں گے۔ اُسے سوچوں کا لبادہ نہ پہنائیں گے۔ تو دھڑکنوں کے مدوجزر تو لازمی ہیں۔ کوئی نئی بات نہیں۔ بس جذبات کے آنگن میں بجلی چمکی، احساس کی حرارت پیدا ہوئی، تپتے ہوئے جسم نے ایک پھریری لی اور اس کے بعد جذبات کی بارش کی نمناک دھند چھا گئی۔ پہلے بھی تو ایک گیت میں ایک معصوم پیاری الہڑ دوشیزہ، ایسی ہی نمناک دھند کی لپیٹ میں آ گئی تھی ٹھیک ہے۔ لیکن وہ تو جنگلوں اور دریائی بیلوں کا مقدس ابدی پیار تھا۔ ہوسناک ہوٹلوں اور آوارہ بہکی ہوئی ادھ جلی سڑکوں کی بحث نہیں۔ اُس میگ کا شراب تو وقتی تھا، آنسوؤں کے زرد سے ڈھل گیا۔ لیکن یہ شراب جو شکنتلا تم اپنے کوٹھے کی چھت پر سے لئے پھر رہی ہو۔ اسے درد کی کس بارش سے دھویا جائے؟!

اور پھر اس بارے میں کیا سوچا جائے۔ سماج کو کوسا جائے، ماحول کو کوسا

جائے۔ گھر کی چار دیواری کو کوسا جائے یا پھر ان گنگناتی "ادبی جدید ترین جذباتی راہوں کو" جو کوئی منزل نہیں دکھاتیں۔ کوئی زندگی بخش مستقبل نہیں لاتیں۔ صرف کچی معصوم سی ادھوری دھڑکنوں کو اُکسا کر انہیں زہر آلود بنا دیتی ہیں۔ — اور پھر کیا صرف ماں باپ کا فرض رہ گیا اور اولاد کے فرض کا بوجھ بھی کمزور بوڑھے کندھوں پر — آخری سانس تک — سکھ اپنی جوان جھولی میں اور دکھ بوڑھی گود میں۔ حقیقتوں کے اژدہے تو سامنے آکر پھنکاریں گے ہی۔ لاکھ گھوڑے کی طرح آنکھ موندھ لو۔

اب میری بات مانو۔ جوانی کے جس آنچل کو شکنتلا تم اپنے سہاگ کا دوپٹہ بنانا چاہتی تھیں نا۔ اسے اب اپنی موت کا کفن بنا لو۔ تلخ بات ہے۔ لیکن اب اس میں تمہارے جیون کی شانتی ہے!

شہر تک پہونچتے چاندنی رات بھی ادھیڑ ادھ مری سی ہو جاتی ہے۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں۔ شہر میں ہر چیز مری مری سی کیوں دکھائی دیتی ہے۔ کیا اب ان پہاڑوں اور میدانوں کے بیچ کا فاصلہ اتنا طویل ہے کہ زندگی سفر کی موت بن جاتی ہے۔ ان پہاڑوں کے چیڑھ اور دیودار کے درختوں پر چاندنی رات کی بھرپور جوانی کیسے اتر رہی ہے۔ شرماتی... لجاتی۔ کسی ان بیاہتا پہاڑی دوشیزہ کی طرح۔ کتنی تقدیس ہے ماحول میں۔ کتنی حسین خاموشی ہے ارد گرد۔ اپنی سانسیں بھی شور محسوس ہوتی ہیں۔ کتنی مدھم سی سرگوشی تھی، ڈاک بنگلے کی مہترانی کی — بڑے بھاگیہ وان ہیں آپ — قدم پڑتے ہی نیا مہمان آگیا۔ چھپا مہمان اور وہ خطرے کا نشان — راستے کی لال تکون — ایک دھواں دار دھماکہ بن کے رہ گئی۔ اب صرف ایک خلا ہے اور ایک مہیب سوالیہ نشان اور سامنے درشنی کی آنکھیں نئے مہمان کی حیات پرور رمق لئے ہوئے۔ اس معصومیت کی روایتی مہمان نوازی کو سنبھال دیا جائے یا اس لال تکون کے بے آواز خطرے کے گھڑیال کی صدا سنی جائے۔ صبح شام کی بڑھتی ہوئی مہنگائی اور نت نئی پریشانیوں کے اس دور میں نئے مہمان تو خطرے کی صلیب ہوں گے ہی۔ ہر غریب کی مسرتیں محدود ہوتی ہیں۔ ان حدود کو اور کیوں کم کیا جائے — کون توڑے اس کی خوشیوں کے دھاگوں کو۔ کس کس کو سمجھایا جائے کہ ان مہمانوں کی برات کتنی اذیت ناک اور بھیانک —

ہو جاتی ہے۔ اپنے بیگانوں کی دُنیا کے لئے اور پھر جب داں کی دین کا زمانہ، اپنی تقدیر میں ماں کے پیٹ سے اپنے ساتھ لانے کا وقت تو اب رہا نہیں۔ گھور کلجگ ہے۔ ابھی ہاتھ دے اس ہاتھ لے کا زمانہ ہے۔ سوچنا پڑے گا۔ اپنے ہاتھ کو دیکھنا پڑے گا کہ لینے والے ہاتھ کتنے ہیں اور دینے والے کتنے۔ عمر کے نہ سہی۔ لیکن ضروریات کے تقاضوں کا پیٹ بھرنا ہی پڑے گا اور اپنے نکتہ چین دل دنیا ناکھو ر تمانی کا گلہ شکوہ کہاں تک، درست ہے کہ خاندانی منصوبہ بندی، جسے وہ ہندی کا شاعر ہونے کے ناطے پریوار نیوجن کا نام دیتا ہے، کا ہنگامہ اب شروع ہوا۔ ورنہ آدھ درجن نئے پرانے مہانوں کو کندھوں پر اُٹھائے اُٹھائے نہ پھرنا پڑتا۔ کس کو بیاہیں۔ کس کو پڑھائیں۔ کس کو کھلائیں۔ دو ہاتھ سمیٹنے والے بارہ ہاتھ لوٹنے والے۔

لال نکون تو نئی ایجاد سہی۔ لیکن اکنامکس کے پروفیسر سے یہ توقع تو نہیں کی جا سکتی کہ وہ سپلائی اور ڈیمانڈ کا تناسب ہی بھول جائے اور اپنے سارے جسم کو شاعر بنا دے اور اُن لاکھوں ہاتھوں کو بھول جائے۔ جو صبح سے شام اور شام سے رات تک خلاؤں میں سوالی بن کر لٹکے رہتے ہیں، اپنے سارے وجود کو پیٹ بنا کر۔ اور کوئی بند کھڑکی نہیں کھلتی، اندر کی روشنی اندر ہی دبکی بیٹھی رہتی ہے۔ بھوک کے کوڑھ زدہ اندھیرے کیسے اُجلے ہونے لگے اور پھر لالہ کرم چند تو اپنے کرموں کا پھل کھا رہا ہے۔ وہ تو اپنے کواڑ کھولنے سے رہا۔ غلے کے انبار، نوٹوں کے ڈھیر، ایک مکمل آراستہ حویلی۔ اولاد کوئی نہیں۔ جہاں مہمان خانے ہوتے ہیں۔ وہاں مہمان کیوں نہیں آتے۔ جہاں روٹی ہے۔ وہاں بھوک کیوں نہیں آتی۔ کیا لکشمی نام کی سنگِ مرمر کی مورتی کو لمبے پیارے نہیں۔ کیا روٹی نہیں چاہتی۔ کوئی میری بھوک بنے۔ لیکن لالہ کرم چند کی پچاس سالہ عمر خوش ہے کہ اُن کی دولت کا، اُن کی روٹی کا اور اُن کی جائداد کا کوئی حصے دار نہیں۔ کسی عمر میں ایک حصے دار بننے آیا تھا، اپنا موت مر گیا۔ لالہ کرم چند کو کوئی تردد نہ کرنا پڑا۔ شامنی جی کا تو پتہ نہیں۔ لیکن لالہ جی کو اپنے مہان کی موت پہ کبھی دُکھ ہوا۔ وہ سب کچھ اپنے ساتھ لے جانا چاہتے ہیں۔ لیکن وہ لاکھوں سوالی ہاتھ جو خلاؤں میں لٹکے رہتے ہیں، اُن کی چھاتی پر گرنے ہی والے ہیں، قبر میں خالی ہاتھ ہی اُترنا پڑے گا۔ شامنی جی سے زیادہ اپنی نوٹوں بھری تجوری کو اپنی

بوری سمجھتے ہیں۔ اُسے اپنی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتے۔

اب چاند بھی لالہ جی کی تجوری بن گیا ہے۔ قدرت کی ساری رعنائیاں سمیٹ کر کسی چور کی طرح اندھیروں کی طرف بھاگ رہا ہے۔ سارا ماحول اُداس ہو گیا ہے، کائنات نے چاندنی کا جو مرمریں لباس پہن رکھا تھا۔ وہ اب تار تار ہو گیا ہے۔ شاید اسی لئے ہر بے جان اور جاندار چیز نے اپنی آنکھیں موندھ لی ہیں۔

ہر چیز اپنے لباس سے پہچانی جاتی ہے۔ بھلا شاہو، پرندے ہوں، پھول پتے ہوں، پیڑ پودے ہوں یا پتھر چٹانیں۔ تین گھنٹے کی جستجو کہیں نہ پہنچا سکی۔ ساتھ کا کمرہ پاس ہے۔ اندر کی روشنی بھی کوئی کم نہیں۔ لیکن پہچان کی آنکھ اندھی ہو کر رہ گئی ہے۔ یہ جاننا مشکل ہو گیا ہے کہ اس نوجوان جوڑے میں لڑکا کون ہے اور لڑکی کون۔ لباس ایک جیسا ہو سکتا ہے۔ لیکن انداز ادائیں تو مختلف ہوں۔ سب کچھ گھل مل گیا۔ ہر چیز ایک دوسرے میں مدغم ہو گئی۔ اب ڈھونڈتے پھرو۔ کون کہاں ہے۔ کیا ہے۔ وقت کی دھارا تو ہر دور میں تیز و تند رہی۔ لیکن تہذیب و تمدن کے بھی تو اپنے مضبوط پاؤں ہوتے ہیں۔ پہچان کی آنکھ کا اندھا پن کب تک ننگے پن کی مشعلیں جلائے رکھے گا۔ زندگی جتنی مختصر ہے۔ اتنی کڑی بھی۔ ایک دن یا ایک رات کے لئے جینے کی سوچ سے عمر تو نہیں کٹ سکتی۔ لمحہ لمحہ مرنا اور بوند بوند جینا اذیت ناک ہو گا ہی۔ بڑی عجیب بات ہے۔ پیار کے رشتے ابدی ہوا کرتے تھے۔ جنم جنم کا ساتھ دیا کرتے تھے۔ اب وقتی ہو گئے اور غم جو وقتی تھی۔ ابدی ہو گئی۔ اسی لئے ذات کی مایوسیوں اور دل کی خود ساختہ اداسیوں اور مجبوریوں کی گھور گھٹائیں چھٹنے میں نہیں آتیں۔ سگریٹ کا بدبو دار دھواں اڑاتے ہوئے اس پر ذرا بھر سوچو۔ یہ فیشن کی کون سی کروٹ ہے۔ کون سی ادا ہے؟!

آس پاس کی ڈوبتی ہوئی خاموشیاں اور گہری ہو گئیں۔ لیکن بند کھڑکی کی روشنی ابھی تک قایم ہے۔ جھوٹے وعدوں، جھوٹے قول و اقرار، جھوٹے پیار کی لمبی رات ہوتی ہے۔ شاید روشنی بجھے ہی نا!

ہمارا ادب

پہاڑوں کی شام کا ٹھہراؤ بدستور قایم ہے۔ شہروں کی شام کا ٹھہراؤ اب کہاں گیا؟
کیوں شام کو بھی دن کی سی حرارت، تیزی اور تندی ہوتی ہے۔ کیا بات ہے۔۔ اپنے مہمان نواز شہر
کی شام بھک منگی کیوں ہوگئی۔ ہر کوئی اپنی ذات کی صلیب اٹھائے ایک دوسرے کے آگے ہاتھ
پھیلائے کھڑا ہے۔ شام کے بے عیب دھندلکے اتنے نشہ آلود کیسے ہو گئے۔ دیر کی عادتیں
چھوڑی بھی تو جا سکتی ہیں۔ ہمیشہ اپنے دل کا ساتھ دینے والا وقت کے قدم تو نہیں ناپ
سکتا۔ پھر یہ بھاگ دوڑ چند عادی مجرم لمحوں کو سلانے کے لئے ہی تو ہے۔ لیکن جرم تو نہیں
سوتا۔ وہ خناتق کے گردے سنبھالے جاگتا ہی رہتا ہے۔ اور پھر عزت صرف اپنی ذات کی
تو نہیں ہوتی۔ بیوی بچوں اور ماں باپ کی بھی ہوتی ہے۔ پہلے گھر کا چولہا دیکھا جائے۔ اس
کے بعد اپنے جیسے کا دھواں دکھائی دے تو اپنے اندر کے عادی مجرم کی آگ بجھائیے۔ یوں
تو کوئی شک نہیں کہ خالی پیٹ بھی سوئیے۔ اپنا آنگن سبھو کا بیاگے۔ زندگی کا غم تو شفقت کے
بل بوتے پر ہی اٹھایا جا سکتا ہے۔ گنگا سنگھ نام لینے سے گنگا جل کا احساس تو نہیں ہو
سکتا۔ پانی کا بھی اپنا رنگ ہے۔ آنسو میں اپنا بوند بوند خون نچوڑ کر رنگ دار بنانے کی کیا
ضرورت۔ اپنے من میں جھانکو۔ ادھ جلے دھندلکوں کو کریدنے سے کچھ نہیں ملے گا!

میرے ملازم کی حیرانی جائز ہے کہ نسوار والے شاہ کی بیوی بھاگ گئی ہے
کیوں کہ بھاگتی تو جوانی ہی ہے اکثر۔ لیکن شاہ جی کو خوشی ہے بند کھڑکی کی روشنی معطر
ہی نہیں ہوتی۔ ان کی نئی محبوبہ کی رسیلی سانسوں سے بھی معمور ہے۔ بلا اعتراض دوسری
شادی۔ دولت کی کوئی عمر نہیں ہوتی۔ اور شاہ جی کا برملا کہنا ہے کہ عورت بھاگ جائے
یا بھگا دی جائے۔ بات ایک ہی ہے۔ اور لوگ تو آج کل کاغذی نوٹ کھاتے ہیں۔
روٹی نہیں اور بلیک کا دھندہ قایم —— دوسری طرف ننھی ٹانگے والا مغموم بیٹھا ہے
اُس کی پیاری رادھا شام سے غائب ہے اور شاید اسے کوئی بھگا لے گیا ہے
لیکن بھروسے پر ہی دنیا کی سڑک چلتی ہے۔ رادھا ضرور لوٹ آئے گی۔ ننھی ٹانگے والے
کو یقین ہے۔ سوچ کا دھاگہ کھولو۔ انسان اور حیوان کی بات ہے۔ بیوی بھاگ جانے
پر کیوں خوشی ہوئی اور ٹانگے کی گھوڑی رادھا کو کوئی بھگا لے جائے۔ تو دکھ کیوں؟"

یہ کیسا سماج ہے۔ کھانے کی خواہش مر جاتی ہے۔ ہضم کرنے کی طاقت نہیں رہتی۔ روٹی ٹھنڈی ہو جاتی ہے۔ دل میں وسوسوں کی عمر بیت جاتی ہے۔ خوبصورت سا گھر گرہست ملتا ہے۔ ہاتھوں میں کام کرنے کی سکت ختم ہو جاتی ہے۔ کام ملتا ہے۔ جب ہم گندی نالی کے کیڑے بن جاتے ہیں۔ کھلی فضائیں دی جاتی ہیں۔ اسی لئے شاید ہم سب عادی مجرم ہیں۔

روٹی روزی کی بھی عمر ہوتی ہے۔ بھوک کی بھی عمر ہوتی ہے۔ جیسے گھر گرہست کی بھی عمر ہوتی ہے۔ اب شام لعل کو ہی دیکھ لو۔ چالیس برس سے اوپر عمر اور ایک کم سن سی بیوی۔ جوانی کی عمر تو دو سو روپے تنخواہ، ماسٹری اور بزرگوں کی عیال داری کو سنبھالتے نکل گئی۔ بھوک کے جنجال میں کون اپنی بیٹی پھینکتا۔ ڈگریاں، شرافت، دیانت داری اور رنگین ریاست نواب لوک کہانیوں کی بات رہ گئی۔ بات دولت اور رتبے کی ہے۔ عمر کون دیکھتا ہے۔ سوکھا سڑا چالیس سالہ جسم کون دیکھتا ہے۔ ایک ہزار تنخواہ ہوئی سب کچھ آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ سماج کی ریت روایت بھی یہی ہے۔ اب مجرم کون ہے سماج یا شام لعل۔ جو اب ایک بڑا افسر ہونے کے باوجود بھی شام لعل ماسٹر پکارا جاتا ہے۔ کبھی کبھی پیشہ بھی ذات کے ساتھ چپک سا جاتا ہے۔

اب میرے قریب کی بند کھڑکی کی روشنی بجھ گئی۔ لمبی باتیں۔ لمبے عشق لمبی باتیں۔ چھوٹی ہوتی ہیں۔ پیار کی کوئی تشریح نہیں۔ من سچا ہو۔ تو آدھی بات سے ساری بات کا پتہ چل جاتا ہے۔ کچی سوچوں کی گرفت بڑی ڈھیلی ہوتی ہے اور ادھوری کہانیوں کے نام بڑے خوبصورت۔ وقتی خوشی سے زمانے کی غمناک دھارا تو نہیں بدلی جا سکتی۔ بند کھڑکی کی روشنی کا دائرہ تو تنگ ہو گا ہی۔ وہ چاندنی رات کی وسعت تو نہیں بن سکتی۔ سوچو اور اپنی ذات کے بند کواڑوں کے اندھیروں میں جھانکو۔ شاید کہیں مسرت کا لمحہ جاگا ہوا مل جائے اور بند کھڑکی کی روشنی باہر بھاگ آئے!

☆

امین کامل

کافی ہاؤس

دوارکا ناتھ سے میری پرانی جان پہچان ہے۔ میرے والد صاحب اور دوارکا ناتھ کی یار برادری آپس میں بیس سال تک رہی ہے۔ دوستی بھی ایسی جیسے ایک جان دو قالب۔ جب تک میرے والد صاحب زندہ تھے۔ دوارکا ناتھ ان سے ہفتے۔ دو ہفتے بعد ضرور ملنے آتے، اگرچہ وہ کہیں میلوں دور بھی ٹھہرنے والے ہوتے۔ میرے والد صاحب کیساتھ دوستی ہونے کی وجہ سے وہ میری عزت کرتے۔ اور اپنا خاص عزیز مانتے ہیں۔ وہ میرے آگے تھانے کی ضمنی بھی پوشیدہ نہیں رکھتے جبکہ بڑی خفیہ چیز ہوتی ہے۔ دوسری چھوٹی موٹی باتوں کی تو بات ہی نہیں۔

پرسوں میں ایک ذاتی کام کے لئے اُن سے ملنے گیا۔ اس سے چند ہی دن پہلے شہر میں کچھ سیاسی گڑبڑ ہوئی تھی۔ چند لوگوں نے دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی کرکے حکومت کے خلاف مظاہرہ کیا تھا۔ باتوں باتوں میں، میں نے دوارکا ناتھ سے پوچھا — یہ تو ٹھیک ہے کہ مظاہرہ کرنے والوں کو گرفتار کرنا آپ کا فرض تھا۔ مگر یہ کیسا اندھیر ہے کہ آپ لوگوں کے گھروں میں گھس جائیں اور وہاں سے بے گناہوں کو گھسیٹ کے قید کروائیں۔ میں خود بھی ایسے دس بیس آدمیوں کو جانتا ہوں جو ان جھمیلوں میں پڑتے ہی نہیں۔ آخر اس بدعنوانی

سے آپ کو ملتا کیا ہے؟"

دوار کا ناتھ میری بات پر آپ ہی آپ مسکرائے۔ اس کے بعد جیب سے سگریٹ کیس نکالا۔ ایک اپنے ہونٹوں میں دبا کے اور ایک میری طرف بڑھا کر کہنے لگے۔ "ہوں ۔۔ تو آپ اس بات کا جواب سننا ہی چاہتے ہیں گویا! ۔۔ بہتر ہے ۔۔ سنیئے"

دوار کا ناتھ نے جو کچھ مجھے بتایا۔ اس پہ مجھے ایک پرانی بات یاد آگئی ۔۔ کم سے کم چھبیس سال پرانی بات ۔۔ ان دنوں کشمیر پہ مہاراجہ ہری سنگھ کی شخصی حکومت تھی۔ اب اس حکومت کو سینتالیس دس ستاون اور ایک اٹھاون ۔۔ پورے گیارہ سال ختم ہوتے ہو گئے ۔۔۔

قصہ یوں ہوا کہ ایک دن میں دس بجے صبح کالج جا رہا تھا۔ میں نے ایک جگہ دیکھا کہ چند پولیس والے کوئی پانچ چھ گائیوں کو گلے سے گھسیٹتے اور کھینچتے ہوئے لے جا رہے تھے۔ ان پولیس والوں کے پیچھے پیچھے چند عورتیں اور ان کے چھوٹے چھوٹے بچے روتے اور چلاتے پیٹتے چلے آ رہے تھے۔ ایک پولیس والا ان عورتوں سے کہہ رہا تھا ۔۔ "یا تو تم ہماری بات سمجھ نہیں رہی ہو یا تم ہیں بھائی کوئی دھوکا دکھائی دے رہا ہے ۔۔ ؟"

"دیکھو جی ۔۔ ہم آپ کے پاؤں پڑتی ہیں ۔۔" عورتیں بڑے ترنم سے بول رہی تھیں ۔۔ "خدا کے لئے ان گائیوں کو چھوڑ دو ۔۔"

"چھوڑے نصیبا اپنے ۔۔ اور کیا ۔۔" دوسرا پولیس والا بڑی درشتی سے کہہ رہا تھا ۔۔ "شاید تمہیں یقین نہیں آتا کہ ہم دو تین اٹھا دیں گے ۔۔" وہ دوسرے پولیس والے سے کہہ اٹھا ۔۔ "یار انہیں دو انہیں پیسے ۔۔ اطمینان ہو جائے گا ان کو ۔۔"

اس پولیس والے نے انہیں پیسے دیئے مگر ان عورتوں نے نہیں لئے ۔۔۔ وہ صرف ان کے پاؤں پڑ رہی تھیں ۔۔ اور گائیں چھوڑنے کا سوال کر رہی تھیں میں حیران تھا کہ پولیس والے اگر ان گائیوں کو آوارہ ہونے پر کانجی ہاؤس لے جا رہے ہیں، جو کہ قاعدہ قانون ہے۔ تو پھر یہ دھڑے کس بات پہ ہو رہے ہیں؟ یہ پولیس والے کس لئے ان کو پیسے دے رہے ہیں۔ میں ان کے نزدیک گیا۔ اور پوچھا ۔۔

"کیوں جی ۔ کیا بات ہے۔ آپ ان گائیوں کو کہاں لے جا رہے ہیں؟"

"اجی بات دراصل کچھ بھی نہیں" ــــ ایک پولیس والے نے جواب دیا۔
"یہ بیچاری گائیں کانجی ہاؤس لے جائی جاتی ہیں۔ ہم ان سے کہہ رہے ہیں کہ ادھر ہم نے ان کو بند رکھا،
ادھر تم چھڑا لاؤ ــــ ہاں اب ان کو دس آنے تاوان کے طور پر دینے ہوں گے۔ وہ بیہ
رہے جارہے۔ بات تو بالکل سیدھی ہے۔ مگر ان مالزادیوں کی سمجھ ہی میں نہیں آتی۔ ذرا
آپ ہی سمجھائیں ان کو۔ یہ رہے دس آنے ــــ لیجئے آپ ہی چھڑا دیجئے ــــ"
میں نے نہ تو وہ پیسے ہی لئے اور نہ ہی ان عورتوں کو سمجھایا۔ کیوں کہ خود میری
سمجھ میں یہ مسئلہ نہیں آرہا تھا کہ گائیں کسی اور کی کانجی ہاؤس میں بند رکھی جائیں اور پولیس
والے اپنی جیب سے تاوان دیں۔ آخر کیوں ــــ؟ اگر ان کی غربت پر رحم آتا ہے۔ ٹھیک
ہے۔ ابھی جانا ہے کبھی۔ تو پھر یہ گائیوں کو ہی کیوں نہیں چھوڑ دیتے۔ میں نے پھر ان سے پوچھا:
"آپ کا کہنا ٹھیک ہے ــــ مگر آپ ان کے لئے پیسے کیوں دے

رہے ہیں؟"
"اجی کیا کہیں ــــ ایک پولیس والے نے اپنے چہرے پر مسکینی کے آثار
پیدا کئے ــــ کل دہلی سے مہاراج صاحب آئے تھے ہوائی جہاز سے یہاں۔ آپ کو بھی
معلوم ہی ہوگا کہ ہوائی اڈہ سے گنگا رستا ہی محل تک ساری سڑک بند ہوگئی تھی۔ جو کہ
اس وقت ہوتی ہی ہے جب مہاراج صاحب نے کہیں آنا جانا ہو ــــ آپ تو جانتے ہی
ہیں کہ اس سڑک پر پھر کوئی پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا، تب تک کہ نہ مہاراج صاحب
چلے جائیں۔ کل بھی سڑک کے دونوں طرف پولیس کا پہرہ تھا۔ بدقسمتی سے جب مہاراج
صاحب ریشم خانہ کے قریب پہنچے، اسی لمحے ایک گلی سے دو گائیں دوڑتی بھاگتی آئیں اور
سڑک پار کرنے لگیں۔ پولیس والوں نے بہت ہاتھ پاؤں مارے۔ مگر کچھ نہ کر سکے۔ جب تک کہ
نہ گائیں وہاں سے ٹل گئیں۔ مہاراج صاحب نے اسی وقت ڈی۔ آئی۔ جی پولیس کو
حکم دیا کہ وہ سب پولیس والے معطل کر دیئے جائیں جو اس وقت ڈیوٹی پر تھے۔ اور اس
کے ساتھ ہی D.I.G نے آرڈر دیا کہ جہاں کہیں بھی کوئی آوارہ گائے ملے۔ اسے کانجی ہاؤس
میں بند کر دیا جائے۔ جو کوئی اس حکم کی تعمیل میں سستی برتے گا وہ معطل کر دیا جائے گا۔ آخر
ہمارے بھی بال بچے ہیں۔ ہم کسی اور کی خاطر اپنی روزی سے کھیلنے سے رہے۔ ہم نے بھی

اپنی ڈیوٹی پر مستعد ہونے کا ثبوت دینا ہے۔ ہمیں اس بات کا کہیں بھی کوئی ادارہ کا ئے دکھائی نہیں دی جسے ہم کانجی ہاؤس لے جاتے۔ اب ہم نے ان کے گئوشالے سے ان کی گائیں نکالیں۔ محض کانجی ہاؤس لے جانے کے لئے۔ ٹھیک ہے انہیں دس آنے جرمانہ دینے پڑیں گے — وہ یہ رقم — اب اس میں ہم کونسی ایسی ویسی بات کہہ رہے ہیں" میں اس دن بھی مسکرایا اور پرسوں بھی۔ جب دنار کا ناکتو نے میری بات کا کچھ ایسا ہی جواب دیا۔

ترجمہ: فاروق مسعودی

غنی کاشمیری

(فارسی)

از: ڈاکٹر ریاض احمد شیروانی

کشمیر کے ممتاز فارسی شاعر غنی کاشمیری پر مبنی محققانہ اور فاضلانہ نظر،

دیدہ زیب، بہترین زیور طباعت سے آراستہ۔

مزید تفصیلات کے لئے ہمارے شعبہ مطبوعات سے خط و کتابت کیجئے

افاق احمد

چھوئی موئی

میں نے گملے میں لگے ہوئے ایک پودے کی طرف اشارہ کیا اور کہا۔
"لوگ پھول پسند کرتے ہیں اور مجھے یہ چھوٹی چھوٹی پتیوں کا پودا
پسند ہے..."
"کیوں اس میں کیا رکھا ہے...." اس نے میرے شانہ پر جھک کر اسے
دیکھتے ہوئے کہا ——
اب اس کے سانسوں کی نرم آنچ میرے چہرے کو پگھلا رہی تھی... اور مجھے
ایسا لگ رہا تھا جیسے میں ہوا میں تحلیل ہو جاؤں گا.... اس نے مجھے خاموش پا کر اور جھک
کر میری آنکھوں میں دیکھنا چاہا.... اس کے یاقوت سے تراشے ہوئے لب میرے سامنے
آگئے.... اور میں نے انھیں چوم کر اس ابلتی ہوئی آگ کو ٹھنڈا کر لیا....
اس کا نام نازلی تھا اور وہ مجھے بہت پسند تھی.... مجھے یقین ہے
کہ جب اسکی تشکیل کے لئے مٹی گوندھی جا رہی ہو گی تو اس میں انکی غلطی سے یا پھر فرشتوں
نے جان بوجھ کر ریشم کی آمیزش کر دی تھی۔ اسے اپنے قریب پا کر اسے چھونے کی خواہش
کو میں کبھی دبا نہیں پایا.... بالکل اسی طرح مجھے بھی اسے پہننے کی خواہش پیدا ہوتی
تھی، جیسے کسی ریشمی کپڑے کو دیکھ کر اس کی سرسراہٹ انسان اپنے ننگے جسم پر محسوس
کرے ——......
وہ میری بہت اچھی دوست تھی اور ہم دونوں گھنٹوں ایک دوسرے
سے بیٹھے باتیں کیا کرتے.... اکثر ہمارے ہاتھ ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہوتے...

اسے گلاب اور موتیا پسند تھے..... ہلکے شوخ رنگوں کے کپڑے پسند تھے۔ گاتی مسکراتی زندگی پسند تھی..... دل کی گہرائیوں سے نکلے ہوئے قہقہے پسند تھے۔ وہ مجسم زندگی تھی..... بھرپور زندگی کہ اچانک اگست کی ایک شام کو میں نے گملے میں لگے ہوئے ایک پودے کی طرف اشارہ کیا اور کہا......

"لوگ پھول پسند کرتے ہیں اور مجھے چھوٹی چھوٹی پتیوں والا پودا پسند ہے"

اس نے مجھے گم سم پاکر میرے ہاتھ میں چٹکی لی اور کہا

"اے ندیم.... بتاتے کیوں نہیں کہ تمہیں یہ پودا کیوں پسند ہے" میں نے لذت کے آغوش سے ابھر کر اس سے کہا.....

اس میں نزاکت ہے.....

نزاکت ابھی آئی ہی نہیں......

یہ بہت حساس ہے.....

مجھ سے بھی زیادہ.....

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ جن میں ہلکی سی سنجیدگی تھی.... اور وہ ایک سوالیہ نشان! جیوں کہ میں صحیح جواب دیکر اس کا دل توڑنا نہیں چاہتا تھا..... اس لئے نازلی سے میں نے صرف اتنا کہا۔

"تم اس کی ایک پتی..... صرف ایک پتی چھو کر دیکھو"

اس نے پتی کو چھوا اور پھر جیسے بجلی کی ایک لہر پورے پودے میں دوڑ گئی اور وہ مرجھا گیا......

نازلی کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں... اس کے پوچھنے پر میں نے بتایا کہ اس پودے کا نام "چھوئی موئی" ہے.... شروع شروع میں تو وہ اس کے لئے کھیل تھا... مگر پھر میں نے محسوس کیا کہ وہ کھیل اب سنجیدگی اختیار کرتا جارہا ہے.... وہ گھنٹوں اس پودے کے پاس بیٹھی رہتی..... اس کی طرف انگلی بڑھاتی چھونے کے لئے مگر پھر پیچھے ہٹا لیتی۔

ایک دن میں نے تنگ کر اسے شانوں سے پکڑ کر کھڑا کر دیا۔ اور میں نے

جب دیکھا تو اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔

"تم نے مجھے چھوا کیوں......" وہ غصے سے کانپ رہی تھی.....

"نازلی یہ تم کیا کہہ رہی ہو....." میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا..

"میں ٹھیک کہہ رہی ہوں سر ٹرینڈیم! آپ مجھے اچھے ضرور لگتے ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ آپ میرے جسم کو اپنی تفریح کا ذریعہ سمجھیں۔ غصّہ کی وجہ سے میرے ذہن میں الفاظ گھٹ کر رہ گئے..... میں نازلی کو تقریباً دو سال سے جانتا تھا... میں نے اسے ہمیشہ ایک اچھا اور بے تکلف دوست سمجھا اور بس!

نازلی کو میرے چہرے سے میرے غصّہ کا اندازہ ہوا اور وہ یہ کہہ کر چلی گئی۔

"میں آپ کو بہت پسند کرتی ہوں لیکن مجھے آپ کبھی چھوئیں نہیں ورنہ میں چھوئی موئی کی طرح مرجھا جاؤں گی...."

اور جب سے ہماری نئی زندگی شروع ہوئی... نازلی جب بھی میرے قریب آتی میرے دل میں اسے چھونے اور پانے کی خواہش شدید سے شدید تر ہو تی جاتی... جب اس نے مجھ پر پابندیاں عائد نہیں کی تھیں تو میں کبھی اس کو اس شدت سے چھونا نہیں چاہتا تھا اور اب..... وہ باتیں کرتی اور میرا ذہن صرف اس کے ریشمی جسم میں الجھا رہتا.... مجھے اب لگتا جیسے میری نس نس کھنچ کر ٹوٹ جائیگی....

مگر نازلی کو ہر آنے والا دن اندر ہی اندر سمیٹے جاتا۔ میں نے اس ذہنی جنگ سے تنگ آکر اس سے شادی کی درخواست کی.... اور میں نے اس کی آنکھوں میں گہرے غم کی پرچھائیاں دیکھیں.... اور اس نے اپنے آنسوؤں کو مشکل سے پیتے ہوئے صرف اتنا کہا ——

"پتہ نہیں لوگ شادی کو محبت کی معراج کیوں سمجھتے ہیں.... انسان جنگلی جانوروں سے بڑا گوشت خور ہے.... وہ ہر جسم کو اگر دانتوں سے ممکن نہ ہو آنکھوں کی زبان سے نگل لینا چاہتا ہے...."

اور میرے لئے یہ انتہا تھی.... میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ ٹھیک کہتی تھی یا غلط مگر اس کے بعد میں اس سے ملنے سے کترانے لگا.... اور پھر ایک موقعہ مجھے مل گیا، نہ تھا

اسکالرشپ..... میں امریکہ چلا گیا..... اپنی پی ایچ ڈی مکمل کرنے کے بعد میں تین برس نوکری کے سلسلے میں وہاں ٹھہر گیا.....

اس دوران میں امّی نے میری شادی کہیں طے کر دی..... اور میری ہونے والی سسرال کے تقاضوں نے پھر وطن واپس بلا لیا..... وہی گھر اور وہی ماحول، بس لان اب اتنا خوبصورت نہیں تھا... کیوں کہ دیکھ بھال کرنے والا مالی بوڑھا ہو چکا تھا مولسری کے درخت پر پتے کافی کم ہو گئے تھے۔ مگر ہاں اس کی بھینی بھینی خوشبو اب بھی جادو جگاتی تھی اور اس کے دائیں طرف ایک سوکھا ہوا گملا..... اب مجھے یاد آیا کہ اس میں چھوئی موئی کا پودا میں نے لگایا تھا۔

اور مجھے اچانک نازلی یاد آ گئی۔ اور میں نے امّی سے اس کے بارے میں پوچھا... مگر انہوں نے تو نام سنتے ہی کانوں پر ہاتھ رکھ لئے۔

"ارے بیٹے نام نہ لے اس مردار کا... پہلے تو پتہ نہیں کیا خدا کی مار تھی۔ درجنوں رشتے آئے ــ ہر ایک سے انکار کر دیا... میں نے بھی دبی زبان سے تمہارے لئے بات کی تھی ــ مگر ہر دفعہ ایک ہی جواب... میں شادی نہیں کروں گی۔"

"اور اب..." میں نے گھبرا کر پوچھا۔

کوٹھے والیوں سے بدتر حرکتیں اپنا لی ہیں..... شراب پیتی ہے۔ ہوٹلوں میں بیٹھتی ہے اور غیر مردوں کے ساتھ رنگ رلیاں مناتی پھرتی ہے۔

نور شاہ

پُلِ صراط

جب رات اُترتی ہے اور میری چاہت کا پُلِ صراط پُرانے بوسیدہ پتھروں اور
نیچی خستہ دیواروں کے اُس پار عشق پیچاں کی بیلوں میں کہیں چھپ جاتا ہے اور پُلِ صراط کے نیچے
بے حد گہری ندی کسی پیار کی دھند میں لپٹی ہوئی آہستہ آہستہ بہتی ہے اور کسی خوبصورت سے
جسم پر ریشمی لباس کی سی سرسراہٹ کا احساس جگاتی ہے تو ایک آواز میرا تعاقب کرتی ہے۔
مجھے مسلسل صدا دیتی ہے اور میں اپنے کمرے کی کھڑکی کے پٹ کھول دیتا ہوں اور اپنی ادھ کھلی
آنکھوں کو بند کر کے اپنے ذہن کی نگاہیں سامنے والے مکانوں کی کھلی کھڑکیوں میں گاڑ دیتا ہوں۔
ان کھلی کھڑکیوں کی عجیب عجیب سی کہانیاں میرے ذہن کے بند دریچوں میں قید ہیں۔ میں نے
اپنے ذہن کے دروازے پر ایک بڑا سا تالا چڑھا رکھا ہے۔ کبھی کبھی جب میری سوچوں کا دم
گھٹنے لگتا ہے تو میں اس دروازے کو چند لمحوں کے لئے نیم وا کر دیتا ہوں اور اس سے سب سے
پہلے نازلی کی خواب گاہ کی کھڑکی کی کہانی قریب سرکنے لگتی ہے۔

میں جہاں رہتا ہوں وہ ایک بڑی آباد بستی ہے اور اس بستی میں کئی کھلے،
کئی گلیاں اور کئی سڑکیں ہیں۔ ایک لنک روڈ بھی ہے جو پتھریلی سڑک کو ایک طرف قبرستان
سے اور دوسری طرف بے حد گہری ندی سے جا ملاتا ہے۔

نازلی اسی لنک روڈ کے سامنے والے مکان میں رہتی ہے۔

میں نے اپنے کمرے کی کھڑکی کھول دی ہے۔ اپنی آنکھیں بند کر لی ہیں اور
اب اپنے ذہن کی نگاہوں سے نازلی کی خواب گاہ میں جھانک رہا ہوں۔ میں دیکھ رہا ہوں نازلی
کا چاندی میں پگھلا ہوا سپید جسم تین مردوں کے سامنے پھیلا ہوا ہے اور وہ تینوں مرد اُسے
ایسی دزدیدہ نظروں سے دیکھ رہے ہیں جیسے وہ لڑکی نہ ہو ولایتی شراب کی بوتل ہو
جس کا کارک ابھی ابھی کھول دیا گیا ہو اور جس کے جام جسم میں جذب کرنے کے بعد ہونٹوں

کی پیاس اور شریر کی جستجو اور بڑھ گئی ہو۔

میں ان تینوں مردوں سے واقف ہوں

ان تینوں میں میرا وجود سمٹا ہوا ہے — !!!

تب یہ بستیاں نہ تھیں۔ نہ یہ محلے تھے اور نہ ہی گلیاں اور سڑکیں۔ ایک بڑا ویرانہ تھا۔ اور اس ویرانے میں ایک دن جب پو پھٹ رہی تھی اور دھیرے دھیرے ہوا چل رہی تھی اور اس ویرانے کے چاروں سمت ایک بڑی لطیف سی سرسراہٹ جگا رہی تھی دفعتاً بادلوں نے ویرانے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ پہلے بادل گرجے۔ خوب گرجے اور برسنے سے پہلے ہی ان کی اوٹ سے بجلی برگد کے ایک بوڑھے درخت پر جا گری۔ برگد کے سینے میں ایک بڑا شگاف ہو گیا۔ اور اس شگاف میں سے ایک عورت پھوٹ پڑی۔ وہ الف ننگی تھی۔ لیکن اس نے اپنے لمبے بالوں سے اپنے سارے جسم کو لپیٹ رکھا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے آگے بڑھی۔ بڑھتی ہی رہی جہاں جہاں اس کے قدم پڑے وہاں پھول کھلے۔ کھلتے ہی رہے اور جب یہ ویرانہ ایک خوشنما سرسبز جنگل میں بدل گیا تو وہ ایک گپھا کے اندر چلی گئی۔ کہتے ہیں وہ وہاں تپسیا کرتی رہی اور اسے وہاں نروان مل گیا۔ اور جب بادل خوب گرجے اور گرج کر برسنے لگے تو وہ برستی رات کے اندھیاروں میں گپھا سے باہر آئی لیکن وہ تنہا نہ تھی ایک ننھا منّا بچہ اپنا منہ بار بار اس کے سینے پر مار رہا تھا۔ جیسے وہ بے حد پیاسا ہو۔ اس کے منہ پر دودھ کی چھینٹیں تھیں۔

نازلی مسکرا رہی ہے۔ چھوٹے قد کا بے حد معمولی آدمی بار بار اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہا ہے۔ نازلی سرخ رنگ کا گلاس اس کی طرف بڑھا رہی۔ گلاس سرخ نہیں ہے۔ بلکہ اس کے اندر سرخ مے ناب بہہ رہی ہے۔ وہ بار بار اپنا چھوٹا سا منہ اس گلاس پر مار رہا ہے۔ اسے دیکھ کر مجھے اپنا بچپن یاد آتا ہے۔ اس آدمی کے روپ میں میرا ماضی لوٹ آیا ہے۔ میں بھی اپنے ہونٹوں پر خشک زبان پھیر رہا ہوں۔ مجھے ایک بوند دودھ کی تلاش ہے۔ کاش نازلی ایک بار پھر گپھاؤں میں چلی جاتی۔ کاش اسے ایک ایک بار پھر نروان مل جاتا۔ میرا بچپن ایک بار پھر لوٹ آتا اور میں نازلی کے سینے پر بار بار اپنا سر دے مارتا۔ چھوٹے قد کے آدمی نے شاید کچھ زیادہ پی لی ہے۔ اس نے اپنی آنکھیں بند

کھڑی ہیں اور وہ کمرے کے ایک کونے میں فرش پر بیٹھ گیا ہے۔

نازلی نے اپنی بانہیں پھیلا دی ہیں اور ان بانہوں میں میری جوانی سمٹ کر آگئی ہے۔ ہاں اب اس کی بانہوں کی گرفت میں ہنستا مسکراتا مرد نازلی کے ہونٹوں کی لالی چرا رہا ہے میں اسے جانتا ہوں۔ یہ میں ہوں۔ نہیں میں نہیں ہوں۔ میرا خیال ہے یہ میرا تصور ہے۔ نازلی کی بانہوں کی گرفت سخت ہو گئی ہے۔ یہ میں ہی ہوں۔ یہ میرا حال ہے اور مجھے لگ رہا ہے جیسے میں نازلی کو اپنے بازوؤں میں اٹھا کر پھر رہا ہوں۔ اسے اس لذت سے آشنا کرا رہا ہوں جو جوانی کی دین ہے۔ اس کی جاگتی بھینگی دھڑکنوں سے ایک انجان سی کہانی دہرا رہا ہوں اور حال کے کبھی ختم نہ ہونے والے سفر کے نشان میں کھنکنے کی تیاری کر رہا ہوں۔

چھوٹے قد کا آدمی اب بھی سویا ہوا ہے۔ نازلی نے اسے اپنے دونوں ہاتھوں میں اٹھا کر کھڑکی سے باہر پھینک دیا ہے اور مجھے لگ رہا ہے جیسے ابھی ابھی میرا ماضی اسی کھڑکی سے کوسوں دور پھینک دیا گیا ہو۔ اب نازلی ہنستے مسکراتے مرد کو لے کر کمرے سے باہر چلی گئی ہے۔ شاید اس گپھا کی تلاش میں جہاں اسے نروان ملا تھا۔ لیکن اسے نروان مل بھی گیا تو کیا ہوگا۔ کیا میرا ماضی میرا بچپن لوٹ کر آئے گا۔

اف مجھے کیا ہو گیا ہے۔ یہ میں سب کیا دیکھ رہا ہوں۔ کیا یہ سب حقیقت ہے۔ کہیں خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں۔ میرے ہاتھ پیر کانپ رہے ہیں۔ میں اپنے کانپتے ہوئے ہاتھ اپنے سر پر پھیر رہا ہوں۔ حال کے کبھی ختم نہ ہونے والے سفر کا انت قریب آگیا ہے۔ میرے سر کے بال سفید ہو چکے ہیں۔ میری آنکھوں کی بینائی کمزور ہو چکی ہے۔ یہ میں نہیں ہوں یہ میرا مستقبل ہے۔ ہاں مجھے اپنا مستقبل اس تیسرے آدمی کے روپ میں نظر آرہا ہے جو نازلی کے کمرے کی کھڑکی کا سہارا لئے حسرت بھری نظروں سے بار بار دروازے کی طرف دیکھ رہا ہے۔ اسے بھی نازلی کا انتظار ہے۔ وہ کانپتے لرزتے ہاتھوں سے بار بار اپنے چہرے پر بکھرا پسینہ پونچھ رہا ہے۔

نازلی کمرے میں لوٹ آئی ہے۔ وہ اب تنہا ہے۔ وہ میرے حال کو کہیں چھوڑ کر آئی ہے۔ وہ ٹکٹکی لگائے بوڑھے آدمی کی جانب دیکھ رہی ہے۔ وہ شاید بوڑھے کی صورت میں اپنے مذاق کو تلاش کر رہی ہے۔ لیکن بوڑھے کی آنکھوں میں ہوس ہے۔ جو تیز

ہوتی جارہی ہے۔ اب ایک آواز میرے کانوں سے ٹکرا رہی ہے۔ یہ نازلی کی آواز ہے۔

"بوڑھے کھوسٹ یہاں آؤ..... اب کبھی تیرا جی نہیں بھرا جب تو چھوٹا بچہ تھا میں نے تجھے اپنے نتھنوں کا دودھ پلایا۔ جب تم نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا میں نے تیری رگوں میں خون کی گردش تیز کردی اور اب..... اب موت تیرے قریب ہے، اور تو..... تو..... آ قریب آ......"

بوڑھا آگے بڑھنا چاہتا ہے۔ اپنی بوڑھی آنکھوں کی ہوس کو نازلی کے جوان نرم گرم سینے میں گم کر دینا چاہتا ہے۔ لیکن وہ کانپ رہا ہے۔ اس نے کھڑکی کے پٹ کا سہارا لیا ہے۔ شائد اس کے پاؤں جیسے طویل مسافت سے تھک گئے ہوں۔ نازلی کے چہرے پر بڑی زہریلی مسکراہٹ ناچ رہی ہے۔ وہ زہریلی مسکراہٹ جو موت کا پیغام سناتی ہے۔ میں اپنے مستقبل کی اس قدر بھیانک موت نہیں دیکھنا چاہتا۔ نہیں دیکھنا چاہتا۔

نازلی اب قہقہے لگا رہی ہے!

میں نے اپنے ذہن کا نیم وا دروازہ بند کر لیا ہے۔ میں اب دوسری کھڑکیوں کے اندر جھانکنا نہیں چاہتا۔ میں ان کھڑکیوں کی کہانیوں کو دوہرانا نہیں چاہتا۔ میں اب کبھی اپنے ذہن کا دروازہ نہیں کھولوں گا — کاش میری سوچوں کا دم ایک ہی بار گھٹ جاتا اور اس گھٹن میں میرا ماضی، حال اور مستقبل ایک ہو کر ایک ہی تیں مراحل کو پار کرتے کرتے اس گہری ندی میں ڈوب جاتے جو کسی یاد کی دھند میں لپٹی ہوئی آہستہ آہستہ بہتی ہے۔

———————————!

برج پریمی

لمحوں کی راکھ

رات کتنی بھیانک ہے۔

میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا ہوں۔ چاروں طرف اندھیرے کے گھنے جنگل پھیلے ہوئے ہیں۔ کچھ بھی سوجھائی نہیں دیتا۔ میں گم سم سناٹے کی آواز پر کان دھرے من کے کواڑ کھولے دیکھتا جا رہا ہوں۔ پسینے میں شرابور۔ دل کی دھڑکنیں لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جا رہی ہیں۔ لگتا ہے جیسے کوئی طوفان جاگ رہا ہے۔ اُس کونے میں میری بیمار بیوی لیٹی ہوئی ہے۔ دو مہینے سے بیمار ہے۔ اُس کی پرانی بیماری پھر لوٹ آئی ہے۔ میں نے ہر ممکن کوشش کی ہے کہ اُسے موت کے منحوس سائے سے دُور رکھ دوں۔ مگر وہ خون تھوک رہی ہے۔ وہ میرے بچوں کی ماں ہے۔ میرے ٹوٹے ہوئے گھروندے کی مالکن۔ میں دن رات ایک کر کے صبح سے شام تک پڑھا پڑھا کر کماتا ہوں۔ تاکہ اس کی زندگی کا سورج ڈوب نہ جائے۔ اور اُس کی آنکھوں میں حسرتوں کے آنسو نہ رہ جائیں۔ لیکن اُسے کون سا گھن کھائے جا رہا ہے؟ میرا ذہن شل ہو چکا ہے۔ میری آنکھوں میں حسرتوں کے آنسو ٹپک رہے ہیں ـــــ پاس ہی بچے سر اوندھائے ہوئے سو گئے ہیں۔ اُن کے بچپنے کے خواب بھی جیسے روٹھ گئے ہوں۔ اندھیرے کے اس دبیز پردے کے نیچے سے اُن کی سہمی سہمی آنکھوں کی ناامیدیاں اور مایوسیاں صاف نظر آ رہی ہیں۔ یہ سہمی سہمی آنکھیں پھیل جاتی ہیں اور الماس کے بے رنگ جیکر میں پیوست ہوتی جا رہی ہیں ـــــ "ہٹ جاؤ میرے سامنے سے...... مجھ سے کیا لینے آئی ہو؟ اب تو دس سال بیت چکے ہیں۔ زمانہ کہاں سے کہاں چلا آیا ہے۔ میری آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے ہیں۔ اور میرے خوبصورت

چہرے پر وقت کے تھپیڑوں کے نشان صاف نظر آتے ہیں۔ جب اُس دن بھی تم سے متاثر
نہیں ہوا تھا جب تم میرے مردانہ جبلّاں پہ لٹو ہو گئی تھیں۔ تم میں رکھا ہی کیا تھا؟ ایک پولی
ہی سی صورت، خالی خولی جسم، نہ کوئی قوس اور نہ کوئی زاویہ، ایک بے ڈھنگی سی مردانہ
آواز...... آوازیں تو مجھے اس خوفناک سناٹے میں اس وقت بھی رستی ہوئی معلوم ہوتی ہیں
جیسے سناٹوں نے آوازوں کو چاروں طرف گھیر لیا ہو۔ یہ آوازیں اس وقت میرے من کے
سناٹے میں بھی گونج رہی ہیں۔

اور میں نے الماس کی آوازوں کو روند ڈالا —— تم نے اپنے طور
سے خوب انتقام لیا۔ تم راج کی باہوں میں جھول گئیں۔ اور میری طرف پلٹ کر آنکھ سے بھی
نہ دیکھا۔ میں تمہارے تیاگ اور تپسیا کو دیکھ دیکھ کر حیران ہوتا گیا۔ تمہاری بے رنگ آنکھوں
میں عشق کی قوس قزح جھلملانے لگی۔ راج کے جیومیٹری بکس نے تمہارے جسم کے خالی کاغذ
پر کتنی ہی قوسیں اور کتنے ہی ٹیڑھے میڑھے خطوط ابھار دیئے۔ سارے گڑھے بھر گئے
اور تمہارا جسم ایک مخملی ہلال بن گیا۔ اور میں —— تمہاری نیلی آنکھوں میں کنول کے
پھول تلاش کرتا رہا۔ جس بے پناہ شوق کو لے کر تم میرے سایوں کے پیچھے بھاگتی رہی تھیں۔
اسی گداز نے مجھے تمہاری مسکراہٹ کو چومنے کے لئے بے قرار کر دیا۔ ہم دونوں کی دنیا ایک
جیسی ہوتے ہوئے بھی کتنی دور تھی۔ تمہیں پاتال کی تلاش تھی اور مجھے آکاش کی کھوج!

آکاش پہ سیاہی چھائی ہوئی ہے۔ تارے اندھیرے کے قبرستان میں
دفن ہو چکے ہیں۔ اندھیرا ہی اندھیرا گھٹا ٹوپ تاریکی...... دنیا مر چکی ہے۔
میرے کمرے میں کتابوں کے ڈھیر کے قریب ایک سگریٹ سلگ رہا ہے۔ کوئی دھوئیں
کے مرغولے فضا کی تاریکی میں بکھیر رہا ہے، دھواں ہی دھواں...... کڑوا
کسیلا دھواں..... کاجل کے گھنے سائے میں ڈوبی ہوئی نیلی آنکھیں پھر بلا رہی ہیں —
لیکن جوں ہی آگے بڑھتا ہوں۔ آنکھوں کے دریچے بند ہو جاتے ہیں۔ خاموشی.... مکمل
خاموشی، کوئی آواز نہیں.... جیسے چاند اچانک گہنا جائے —— اور میں کٹ کے
رہ جاتا ہوں۔ دراصل میں چغد ہوں۔ منٹو کا چغد، عشق کی قوس قزح کو تھامنے کے

لیے فنکار ہاتھوں کی ضرورت ہے جو دور دور تک پھیل سکیں۔ ان سمندروں کو چھو سکیں
جہاں حیا کا اجالا پہرہ دیتا ہے۔ حسن کے مندر میں آرتی کون اتارے؟

تبسم..... چاند..... ہے —— چاند کی طرف دیکھ دیکھ کر انسانی بچپن
کا افسانہ بیت چکا ہے۔ چاند ٹکڑے ٹکڑے ہو کر آج ہر ملک کی تجربہ گاہوں میں پڑا ہوا ہے
گھٹ گھٹ کر گھل جانے کی فرصت کہاں؟ پرانے لوگ سودائی تھے۔ چاند سے عشق
کرتے تھے —— چاند اور عشق؟ بات نہیں بنتی۔

زندگی ان منزلوں تک آ گئی ہے۔ جہاں سفید بالوں کی جھاڑیاں
صاف نظر آنے لگی ہیں۔ پھول مرجھا گئے۔ تو ان کی مہک بھی مر جائے گی اور باغ؟ ——
باغ میں الو بولنے لگیں گے۔

اف! حبس سا طاری ہوا ہے۔ سانسیں رک سی گئی ہیں۔ تاریکی کے اس
اتھاہ سمندر میں کوئی چپو مار رہا ہے۔ کوئی آہستہ آہستہ میری طرف بڑھتا آ رہا ہے جانے کون
کا انادر دھڑ دھاڑ صاف سنائی دے رہا ہے۔ میری آواز گلے میں اٹک کے رہ جاتی ہے۔
کوئی آسمانی طاقت؟..... میرا ضمیر؟......

کل صفاکدل میں آٹھ آدمی جل کر راکھ ہو گئے —— بچارے..... عبرت کا
واقعہ ہے۔ لوگ کہتے ہیں، بے گناہ تھے۔ چار بچوں کی ایک ماں اور چار بچوں کا ایک
باپ مستقبل کی ساری امیدیں لیے جل گئے۔ ایک نئی نویلی دلہن سہاگ رات کی سیج پر
جل کر راکھ ہو گئی۔ اور چار بچے اپنی فرشتوں کی سی معصومیت اور پاکیزگی کا تاج سر پہ رکھ
اللہ میاں کے دربار میں باریاب ہوئے اور —— اور..... میں؟ میں نے کتنے گناہ
کیے ہیں۔ کتنے جھوٹ بولے ہیں، کتنی چوریاں کی ہیں، کتنے دل توڑے ہیں، کتنی ریاکاریاں
گلے سے لگائی ہیں، کتنے...... چاروں طرف آگ سی جلتی ہوئی محسوس ہو رہی ہے۔
اور میں جل کر راکھ ہو جاتا ہوں۔ کہیں دور کوئی سرگوشیوں میں کہہ رہا ہے۔ امریکہ
تو ویت نام میں قتل عام کرتا ہے۔ اور وہ جو اشیائے خوردنی میں ملاوٹ کرتے ہیں
وہ جو کاغذی سڑکیں بنا کر سرکاری خزانے کو لوٹتے ہیں اور وہ جو معصوم بچوں کو اغوا کر

کی آنکھیں نکال کر بھیک مانگنے کا پیشہ سکھاتے ہیں۔ اور وہ جو احمد آباد میں مذہب کے
نام پر لوگوں کو زندہ جلاتے ہیں اور وہ جو...... میری راکھ میں پھر سے چنگاریاں سلگنے لگتی
ہیں۔ میں پاگل ہو جاؤں گا ـــــ مجھے گیان و عرفان کی ضرورت ہے۔ ذہن میں بھگوت
گیتا کے اشلوک تازہ ہوتے ہیں..... نہیں نہیں...... مجھے بدھ کا تیاگ چاہیئے.....

مجھے جینے کے صبر کی ضرورت ہے۔ کوئی غیر مرئی طاقت مجھے آواز دے رہی ہے.....
سناٹے کی ان بے پناہ ویرانیوں کو چیرتی ہوئی پکار...... وہ کیا تھا؟
آسمانوں سے کوئی پر اسرار بلاوا؟ آرم سٹرانگ آسمانوں کو پھاندتا ہوا، چاند کے نورانی
ہالے کو روندتا ہوا صحیح و سلامت واپس لوٹا ہے ... اور سیاہ فام مارٹن لوتھر کنگ
کا خون اب بھی بہہ رہا ہے۔ اور بادشاہ خان اہنسا، اخوت اور بھائی چارے کی مالا
اب بھی جپ رہا ہے اور چنڈی گڑھ کا حسن فق ہو گیا ہے ـــــ اف میرا سر گھوم رہا ہے!

وقت بیتتا جا رہا ہے۔ پل بیتتے جا رہے ہیں۔ کمرے کے اُس کونے میں
میری رفیقۂ حیات کراہ رہی ہے۔ شاید سینے میں پھر درد ہو رہا ہے۔ اُس کی آنکھوں میں
آنسو ہیں اور آنسوؤں میں حسرتیں..... اور آج ۲۶ تاریخ ہے۔ میری جیب خالی ہے
اور دوائیوں کا اسٹاک ختم ہو چکا ہے۔ بوتلیں پاس کے طاق پر لڑھک گئی ہیں۔ اور
یار لوگ کہتے ہیں "تمہاری تو چاندی ہے" کتنے کا بینک بیلنس ہے۔ اب تو ٹکسال بن
چکے ہو۔ لینڈ لیڈی نے میرے بچے کو پھر صبح صبح کوسنے دیئے ہیں۔ لاٹ صاحب کی
اولاد! لوگوں کا گھر اجاڑ چکے۔ اب میرا گھر مسمار کرنا ہے۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ جیسے
باپ کا گھر ہے ـــ "میں بچے کی آنکھوں میں سویرے سویرے شبنم کے دو قطرے دیکھ چکا
ہوں ـــــ ایک عجیب سی اتھل پتھل ہے من میں۔

اف! یہ رات کبھی ختم ہونے میں نہیں آتی۔ تاریکی اپنے خونخوار جبڑے
کھولے میری طرف بڑھ رہی ہے۔ سویرا کب ہوگا؟ ـــــ سویرا کبھی نہیں ہوگا۔ ملک
میں سیاسی افراتفری ہے۔ قومی کردار تار تار ہو رہا ہے۔ طبقاتی کشمکش.... بورژوا
.... پرولتاریہ.... سوشلزم..... سیاسی پارٹیاں گتھم گتھا ہیں ـــ چاروں طرف

بلیک میل ہو رہا ہے ——

راج نے بھی تو الماس کو بلیک میل کر دیا...... راج ایک جسم فروش ہے،

عشق اُس کا پیشہ اور عورت اسکی مالی ضرورت —— اُس نے کتنی ہی جوان بیواؤں کی نفسیاتی

خواہشات کو تھپایا۔ کتنی ہی ناآسودہ سہاگنوں کی سلگتی ہوئی آگ کو بھڑکایا۔ اُس کی صورت

دکان، اُس کی مسکراہٹ اس کی جنس تجارت —— زندگی کی اس منزل پر آکر اس کے

جنسی جذبات سرد ہو چکے ہیں۔ لیکن پھر بھی طاقت کی گولیاں کھا کھا کر اس نے جذبات

کی ہانڈی کو اپنے جسم کے ساتھ [illegible] رکھا ہے۔ الماس نے اپنا مذہب، ایمان، دولت

اور جسم سب کچھ راج پر نثار کر دیا۔ راج اپنے جسم کے بدلے اُس کے زیوروں کو چھین کر

اپنی بیاہتا بیوی کے زیور بنواتا رہا۔ اپنی مسکراہٹ کے عوض الماس کی ایک ایک کوڑی

خریدتا رہا اور اس سے اپنی آسائش کا سامان کرتا رہا۔ اُس کے جسم کے انگ انگ کو

مسل کر اس کی کوکھ میں ایک بچہ رکھ دیا۔ اور یہ بچہ خام [illegible] ہے۔ اس بچہ

کو کوئی نام نہیں۔ کوئی مذہب نہیں، کوئی جسم نہیں، کوئی روح نہیں، اُس نے منو سے

لیکر ہیگل اور مارکس تک سارے فلسفے کو چاٹ لیا ہے۔

راج کی خاطر —— اُسے صرف ایک سوال ہے۔ اُس کے بچے کی

مسکراہٹ کا ضامن کون ہے؟

راج؟ —— جس نے گناہ کی تپتی ہوئی ریت پر اس کے کنوارے

بدن کو گلے لگایا۔

فلسفہ؟ —— جہاں خشک اور سپاٹ دلائل کے سوا کچھ بھی نہیں۔

سماج؟ —— جو اسے ہندو ماننے کے لئے تیار ہے نہ مسلمان ماننے

کے لئے ——

الماس! چلی جاؤ —— میری نظروں سے ہٹ جاؤ اور بھگتو اپنے

گناہوں کی سزا ——

لیکن میں ہانپ کیوں رہا ہوں؟

میری سانسیں اٹک سی کیوں گئی ہیں؟

میرے دل میں عجیب سی بے نام سی بے قراری کہاں سے چلی آئی ہے؟
تبسم! میری جان! —— یہ تم ہو؟

وہی دراز بال، وہی مستانہ روی، وہی آنکھوں کی نیلی جھیلیں، وہی گالوں کے سیب، وہی سپنوں کی شام، ٹھہر جاؤ۔ میں تمہارے دراز بالوں کو تھام کر آنکھوں سے لگا لوں —— سرمئی سایوں میں ڈھکی ہوئی تمہاری نیلی جھیلوں میں جھانک لوں۔ اور کنول کا ادھ کھلا پھول کھوج لوں۔ تمہارے انتظار میں میری آنکھیں تھک گئی ہیں۔ لیکن تم ہٹ کیوں رہی ہو؟ تمہاری نیلی جھیلوں میں یہ سفید سفید دھارائیں کہاں سے آگئیں؟ —— کہیں؟ —— کنول کا ادھ کھلا پھول بھی...... اف! میں پاگل ہو جاؤں گا۔

ٹھنڈھال ہو چکا ہوں۔ سارا جسم ٹوٹ رہا ہے۔ پسینے چھوٹ رہے ہیں۔ چاروں طرف ایک طوفان گرج رہا ہے۔ جیسے کوئی کشتی طوفانی لہروں میں گھری ہوئی ڈول رہی ہو۔ دیواریں ہل رہی ہیں۔ میرے دماغ پر کوئی زور زور سے ہتھوڑے برسا رہا ہے۔ میٹ! اندھیرے سے لمحے راکھ ہوتے جا رہے ہیں۔ تاریک جنگلوں میں ہوا سائیں سائیں کرتی ہوئی گزرتی جا رہی ہے۔ بے بسی ہاتھ پھیلائے میری طرف بڑھتی جا رہی ہے۔ اور میرے ہاتھ...... اٹھ رہے ہیں۔

خضر مجید

مسافر، سفر اور منزل

بس میں ایک منحوس سناٹا چھایا ہوا تھا —!

پچھلی سیٹ پر وہ دونوں کوڑھی ان گنہگار مجرموں کی طرح سر جھکائے بیٹھے تھے جنہیں عدالت ابھی ابھی موت کی سزا سنا چکی ہو —!

جموں سے بس کا یہ سفر جس دل چسپ انداز میں شروع ہوا تھا۔ بٹوت پہونچتے ہی اس کی تمام رنگینی ان دو کوڑھیوں کی وجہ سے ختم ہو گئی تھی —!

نیلے پھولدار شال میں لپٹی ہوئی نیلی آنکھوں والی لڑکی کے چہرے کو دیکھ کر ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اُسے ابھی ابھی قے ہو گئی — اُس کا چہکنا بند ہو گیا تھا۔ اور وہ اپنے بالوں کی اُس شریر لٹ سے بے نیاز ہو چکی تھی جو بار بار اُس کے رخسار کو چھو لیتی — اُس کے ساتھ بیٹھی ہوئی ادھیڑ عمر کی عورت جو رنگ و نقشہ کی بنا پر لڑکی کی ماں ہی سمجھی جا سکتی تھی سہمی ہوئی نظروں سے کبھی بس ڈرائیور اور کبھی اپنے سامنے والی سیٹ پر بیٹھے ہوئے پولیس کے دو سپاہیوں کو دیکھنے لگی۔ جن کے درمیان صفدر خان بیٹھا تھا —!

صفدر خان — ! جو سات افراد پر مشتمل ایک خاندان کو قتل کر کے فرار ہو چکا تھا! اور اب پانچ سال بعد وشنو دیوی کی گپھا میں ایک سادھو کے روپ میں گرفتار کیا جا چکا تھا — میرے ساتھ بیٹھے ہوئے سب انسپکٹر نے پچھلے پندرہ منٹ میں چار سگریٹ پھونک چکا تھا — ہر سگریٹ سلگانے کے بعد وہ صفدر خان کی طرف ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالتا!

ہمارے پیچھے بیٹھے ہوئے میڈیکل کالج کے دو نوں طالب علموں نے کھڑکی کا

شیشہ ایک انچ اُوپر چڑھا رکھا تھا۔ ! اِن دونوں نے کوڑھیوں کے بس میں سوار ہونے پر سب سے زیادہ شور مچایا تھا۔ یہاں تک کہ وہ بس چھوڑنے پر بھی آمادہ ہو گئے تھے۔ لیکن وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ اِس برف آلودہ موسم میں اس وقت صرف یہی ایک بس سری نگر جا رہی ہے۔ یہ دونوں کوڑھی بٹوت میں بس میں سوار ہوئے تھے۔ !!

ایک لمبا موڑ کاٹ کر جب بس نے دوبارہ رفتار پکڑ لی تو سب انسپکٹر

نے مجھ سے پوچھا!

"یہ دونوں کوڑھی.... اس غضب کی سردی میں سری نگر جا کر کیا کریں گے

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ کوڑھیوں کا ایک بھرپور جائزہ لینے کے لئے گردن موڑ دی۔ وہ دونوں ادھیڑ عمر کے تھے ایک کا چہرہ سلامت تھا۔ دوسرے کے چہرے پر بیماری کا اثر پھیلنے لگا تھا۔ لیکن اُن دونوں کے ہاتھوں پر بندھی ہوئی پٹیاں — اور اُن کی بیماری کا ڈراونا احساس — یہی بہت کچھ تھا۔

"آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا —!"

"سری نگر کے لوگ بڑے رحمدل اور مہمان نواز ہیں۔"

"میں سمجھا نہیں —"

"آپ نہ سمجھیں تو اچھا ہے۔ آپ صفدر خان کی فکر کیجئے وہ کچھ گڑبڑ کرنا چاہتا ہے —"

سب انسپکٹر اچھل کر کھڑا ہو گیا — دونوں سپاہی گھبرا سے گئے۔

"انسپکٹر صاحب — میں پیشاب کرنا چاہتا ہوں —"

بس روک دی گئی — زنجیریں جھنجھنا اٹھیں — سب انسپکٹر کا ریوالور باہر آ گیا۔ کوڑھیوں کے چہروں پر خوف کی پرچھائیاں رقص کرنے لگیں — نہ جانے نا اُمید لوگوں کو زندگی کا ہی انجانا خوف ڈرا رہا تھا

میں بھی پولیس والوں کے ساتھ بس سے باہر آ گیا —!

ہم بٹوت اور بانہال کے درمیان کسی جگہ پر تھے — دھند اس قدر گہری ہو گئی تھی کہ چند گز کے فاصلے کی چیز مشکل سے ہی نظر آ رہی تھی — سب انسپکٹر نے صفدر خان

کو زیادہ دور جانے کی اجازت نہیں دی۔ اُن کے بس کے پیچھے غائب ہوتے ہی انسپکٹر نے ریوالور کا رُخ دیکھا۔۔۔ اور پھر اپنی کلائی پر بندھی گھڑی کو دیکھنے لگا۔۔۔

"رام سنگھ۔۔۔ شیر علی۔۔۔!

سب انسپکٹر نے دونوں سپاہیوں کو ایک ایک کر کے پکارا۔۔۔ لیکن دھند خاموشی سے چھاتی رہی۔۔۔ سب انسپکٹر نے اُس طرف جست لگائی جہاں وہ تینوں دھند میں غائب ہو گئے تھے۔۔۔ اور اس سے پہلے کہ میں بھی اُس کی تقلید کرتا زبردست گھڑگھڑاہٹ سنائی دی۔۔۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے بہت قریب سے بس پر سینکڑوں لوگ گولیاں برسا رہے ہوں۔۔۔ بس تھرتھراہٹ سے گونجنے لگی۔ دور سے دھماکوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔۔۔ میں نے لپک کر بس کا دروازہ کھول دیا اور جلدی سے اندر داخل ہو گیا۔ عین اسی لمحے ایک زبردست دھماکہ ہوا۔۔۔ میرا سر قریب والی سیٹ کے ہتھے سے ٹکرایا۔ اور دوسرے ہی لمحے میری آنکھوں کے سامنے دھند سی چھا گئی۔ میں نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی بے حد کوشش کی۔۔۔ لیکن میرا ذہن اندھیروں میں ڈوبتا چلا گیا۔۔۔!!

دھند دھیرے دھیرے چھٹنے لگی۔۔۔!!

"آنکھیں کھولیے۔۔۔" کوئی مجھ سے کہہ رہا تھا۔

میں نے آنکھیں کھول دیں۔۔۔ سب انسپکٹر مجھ پر جھکا ہوا تھا۔۔۔ اس کا چہرہ زخمی ہو چکا تھا۔ زخموں سے خون رس رہا تھا۔۔۔ میں نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔۔۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔۔۔ چھ پہیوں والی بس ایک بھیانک عفریت کی طرح الٹی پڑی تھی۔۔۔ اُس کے آگے راستے پر چھوٹے بڑے پتھروں کی ایک بہت اونچی دیوار کھڑی ہو گئی تھی۔۔۔ میرے نزدیک نیلی آنکھوں والی لڑکی پڑی تھی۔۔۔ اُس کے ماتھے پر ایک سفید پٹی باندھ دی گئی تھی۔۔۔ اُس کی ماں اُس کے نزدیک بیٹھی رو رہی تھی۔۔۔ اُن سے ذرا فاصلے پر میڈیکل کالج کے دونوں طالب علم یتیم بچوں کی طرح بیٹھے ہوئے تھے۔۔۔ سڑک کی دوسری طرف صفدر خان دونوں سپاہیوں کے بیچ میں بیٹھا تھا۔

"یہ سب کیسے ہوگیا ——!" میں نے سب انسپکٹر سے پوچھا!
میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آرہا ——" انسپکٹر نے ایک گہری سانس لی "سپاہیوں
کی طرف سے جواب نہ پاکر جونہی میں اُن کی طرف بڑھا تو ایک چھوٹا سا پتھر میرے ہاتھ پر لگا۔
ریوالور میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا —— میں سمجھا کہ صفدر فرار ہونے کی کوشش کر رہا ہے
لیکن میرا خیال غلط نکلا —— یہاں تو پہاڑ سے بڑے بڑے پتھر لڑھک رہے تھے ——!
صفدر اور سپاہی جلدی سے پیچھے ہٹ نہ جاتے تو اُن کا سر مرہن گیا ہوتا —— اسی دوران
ایک بڑی چٹان لڑھکتی ہوئی بس کی چھت پر آگری —— اور بس الٹ گئی ۔ شکر ہے کہ
پہاڑ کی جانب الٹ گئی ۔ اگر ڈھلوان کی طرف —— "اُس نے جھرجھری سی لے اور فقرہ
ادھورا چھوڑ دیا ——!
"میں بس میں سے سب لوگوں کو اتار چکا ہوں —— لیکن ——!"
اُس کا سر جھک گیا ۔ پھر خود ہی بولا —— "میں نے اُن دونوں کو اتارنے
کی کوشش کی تھی —— لیکن نہ جانے کیوں میں ایسا نہ کر سکا ۔ ویسے ہی وہ صحیح سلامت ہیں"
"صحیح سلامت نہیں —— صرف زندہ ہیں ——!"
اُس کے ہونٹوں پر ایک بے بس سی مسکراہٹ پھیل گئی —— سرد ہوا کے
جھکڑ زہریلی سوئیوں کی طرح جسم میں گھستے چلے جارہے تھے ۔ آسمان ڈراونی صورت اختیار
کرتا جارہا تھا ——!
" میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ اب کیا جائے —— نہ جانے ہم کس مقام پر
ہیں ۔ آگے راستہ بند ہے پیچھے دور دور تک کسی آبادی کا نام و نشان نہیں ۔ تھوڑی دیر پہلے
میں پچھلے موڑ تک چلا گیا تھا ۔ وہاں بہت نیچے ایک کوٹھا نظر آیا تھا ۔ میرا خیال ہے کہ
ہمیں جلد سے جلد کوٹھے کی طرف بڑھنا چاہیئے ۔ پانچ بج رہے ہیں —— ایک آدھ گھنٹے
میں شام ہو جائے گی —— اس کے بعد ہمارا کام مشکل ہو جائیگا ۔ سب سے بڑی بدنصیبی
یہ ہے کہ ہم سب خالی ہیں ۔ کھانے پینے کی کوئی چیز ہمارے پاس نہیں —— اسی لئے ہمیں
فوراً کوٹھے میں چلنا چاہیئے ——"
میں نے اقرار میں سر ہلا دیا ——

کچی مٹی کا کوٹھا — بے حد غریب کوٹھا — ایک کونے میں کھٹولہ — ایک چولہا جس کی راکھ برف سے بھی زیادہ سرد تھی — خشک گوبر کی ہیک — ایک تاریک غلیظ کونے میں ایک بڑھولی رکھی تھی جس کی تہہ پر مکئی کے چند ایک خشک دانے تھے!

سرد اور نیم تاریک کوٹھے کے ٹوٹے بجھے چولہے سے دھواں اٹھنے لگا تو سب کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک عود کر آئی — جیسے سب لوگ اپنے گھروں میں بیٹھے ہوں — چولہا سلگایا جا رہا ہو — برتن چڑھائے جا رہے ہوں — پوریاں بیلی جا رہی ہوں — کڑھائی میں تیل کڑکڑا رہا ہو — یہ آگ کس قدر پیاری چیز ہے — جب اس کی بلند آبیز دھیمی آنچ ٹھٹھرے دلوں میں زندگی کی حرارت پیدا کرتی ہے — تو جسم کو سکوڑ کر ایک لمبی سانس کھینچ لینا کس قدر حسین معلوم ہوتا ہے —! حرارت پا کر بھولدار شال میں حرکت ہوئی — کوٹھے میں دھواں بھرتا جا رہا تھا اور باہر اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا تھا!

"کِنا — بولو —!"

دفعتاً بس ڈرائیور چیخ پڑا — گرمی کا لمس پا کر وہ اتنی ہی دیر میں نیند کی وادیوں میں بھٹکنے لگا تھا — نیند کچی تھی — چیختے چیختے بیدار ہوا تھا۔

"میں کہاں ہوں —" بڑی بڑی آنکھیں اُبل سی پڑیں۔

"امریکہ کے وہائٹ ہاؤس میں — کِنا تمہارے لئے وہائٹ ہاؤس دھکیل لایا ہے — لو پیو —" میں نے کِنا کے ہاتھوں سے لوٹا لیکر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا —

"ارے یہ سالا تو ٹھنڈا پانی ہے —!"

"شکر کرو کہ مالا نزدیک ہے — ورنہ پیاس بھی نہیں بجھا سکتے تھے"

"مجھے بھوک لگ رہی ہے —!"

"ہم سب تمہارے غم میں برابر کے شریک ہیں —!"

میڈیکل کالج کے دونوں طالب علموں نے اپنی ستی ہوئی آنکھیں اس کی طرف اٹھا دیں — دوسری طرف صفدر خان نے زنجیریں کھٹکھٹائیں۔

"انسپکٹر — میرے لئے کھانے کا انتظام کرو —"

ناں — پھولدار شال سرسراہٹ سی ہوئی!

"اُستاد — مجھے بھوک لگ رہی ہے —!" گنا اپنے ڈرائیور کے کندھے سے لگ کر رونے لگا!

خود مجھے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے میں نے برسوں سے روٹی کی شکل نہ دیکھی ہو — حالاں کہ صرف دس گھنٹے قبل میں ٹھونس ٹھونس کے کھانا چکا تھا — چاول کی سوندھی سوندھی خوشبو خواب بن کر میرے ذہن پر چھانے لگی — میں حیراں اس بات پر تھا کہ سب لوگوں کو یہ ایک دم بھوک کا احساس کیوں ہوا — کیا ہم لوگ رات بھر کے لئے خالی پیٹ نہیں سو سکتے —!

عین اسی لمحے ڈرائیور اپنے کنڈکٹر سے بولا۔

"گنا میں نے تم سے کہہ دیا تھا کہ دو جن بھر پر اٹھا ساتھ اٹھا — سفر کا ہے۔ کیا معلوم کہاں پھنس جائیں — لیکن تو تو ہوا میں اڑتا پھرتا ہے —"

"اُستاد — تم بھول رہے ہو — تم نے پر اٹھے نہیں — پھر ...."

"انسپکٹر — میرے لئے کھانے کا انتظام کرو —" زنجیر پھر دوبارہ جھنجھنا اٹھیں — "تم نے سنا نہیں — میرا دل کم ہو جائے گا — مجھے لگتا ہے —!

صفدر ...." سب انسپکٹر کے جبڑے تن گئے — "تم جیسے کتے کے لئے تو کچھ بھی نہیں۔ میرا بس چلتا تو عمر بھر ....."

اس نے اپنا جملہ ادھورا ہی چھوڑا — اور سپاہی سر اس طرح ہلانے لگا جیسے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی کھو بیٹھا ہو —

"میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ کیا کروں —"

"میرے لئے کھانے کا انتظام کرو —!" صفدر خان دہاڑا —!

"صفدر بھائی —!" میں نے ٹھنڈے پانی کا لوٹا اس کی طرف بڑھایا — "تم جانتے ہو کہ ہم سب اس وقت مصیبت میں گھر چکے ہیں — یہ جگہ آبادی سے نہ جانے کتنی دور ہے — اس زبردست تاریکی اور خطرناک موسم میں تمہارے لئے کھانے کا انتظام کیسے کیا جا سکتا ہے —!

صفدر نے لوٹا ہاتھ میں لیا ـــــ میری طرف ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالی۔

پھر ایک ہی سانس میں لوٹا خالی کر دیا اور پھر سپاہیوں سے بولا ـــ "جلد سو جاؤ ـــــ

مجھے نیند آرہی ہے ـــ" سب انسپکٹر نے زنجیروں کا جائزہ لیا۔ صفدر آنکھیں بند کر کے مسکرایا۔

"انسپکٹر ـ اچھی طرح دیکھ لو۔ تمہارے سپاہی بوڑھے ہو گئے ہیں ـــــ"

"زنجیریں ـ مضبوط ہیں صفدر صاحب" صفدر خان بدستور مسکراتا رہا ـ!

جتنی دیر میں انسپکٹر واپس اپنی جگہ پر آ گیا میں سونے کی تیاری کر چکا تھا

ـــ پیٹ میں ٹھنڈے پانی کے ساتھ چند ایک گرم گرم لقمے بھی ڈالے ہوتے تو میں کب کا سو

چکا ہوتا۔ لیکن معدہ جاگ رہا تھا۔ اس کے باوجود نیند آنکھوں میں بسیرا ڈالنا چاہتی تھی۔ اسی

غنودگی کے عالم میں کوٹھے کے باہر قدموں کی چاپ سنائی دی۔ سب انسپکٹر سرعت کے ساتھ

اٹھ کھڑا ہوا ـ ہم دونوں ایک ساتھ دروازے کی طرف بڑھے۔ چاپ رک چکی تھی۔ دھاڑ سے

پھر لمبی لمبی سانسیں لی جا رہی تھیں۔

"انسپکٹر صاحب ـــ! ایک بے حد دھیمی آواز سنائی دی ـ جیسے کوئی روح

سسک پڑی ہو ـــ

"کون ہو ـــ تم ـــ"

"ہم ـ باہر ـ سردی ـ اندھیرا ـ برف ـــ"

سب انسپکٹر نے دروازہ کھولدیا ـ وہ دونوں (اندر) گر پڑے ـــ

اُن کے چیتھڑوں پر برف کی موٹی تہہ جم ہو گئی تھی ـ ہاتھوں سے پٹیاں کھل گئی تھیں ـــ

زخموں سے خون رسنے لگا تھا ـ چہرے پر بے رحم خدا کے خلاف شکووں کا جال آنکھوں

میں اپنی نادیدہ حسرتوں کی لاشیں ـــ وہ دونوں سر جھکائے رو رہے تھے ـــ!

"انسپکٹر صاحب ـــ ہم باہر ہی رک گئے تھے ـ ہم اندر نہیں آنا چاہتے تھے

لیکن سردی ـ پھر برف .... ہم سے برداشت نہ ہو سکا ـــ" اُن کی نظریں انسپکٹر کے

پیروں پر گڑی جا رہی تھیں ـــ!

باہر برف گر رہی تھی ـــ انتہائی خاموشی کے ساتھ ـــ سب انسپکٹر بد

سے بولا ـــ "غضب ہو گیا ہے ـ برف جس طرح گر رہی ہے کہ صبح تک ......"

سردی کی ایک تیز لہر میرے جسم میں دوڑ گئی — صفدر خان بڑے زوروں سے ہنس پڑا۔

"اب یہ کوڑھا..... ہم سب کی قبر بن جائے گا —!"

"مجھے سخت بھوک لگ رہی ہے..... میں مر جاؤں گا —" بس ڈرائیور بڑبڑانے لگا — "میں ہر صبح چھ پراٹھے چار انڈے اور دو کلو دودھ پینے کا عادی ہوں —"

"ہمارے پاس کچھ آٹا ہے —!" ایک کوڑھی بے حد دھیمے لہجے میں بولا۔

"آٹا —!" بس ڈرائیور چیخ سا پڑا۔

"کچھ دال بھی ہے —"

آٹے اور دال کا نام سن کر میرا دل بُری طرح دھڑکنے لگا — بس ڈرائیور اٹھ کھڑا ہوا — لیکن — پھر نہ جانے کیوں واپس اپنی جگہ دھم سے بیٹھ گیا — اس کے بیٹھتے ہی زنجیریں جھنجھنا اٹھیں — صفدر دونوں سپاہیوں کو گھسیٹتے ہوئے کوڑھیوں کی طرف بڑھ رہا تھا!—

"نکالو — جلدی نکالو —!" دونوں کوڑھی ایک دوسرے کے نزدیک کھسکنے لگے —!

"تم نے سنا نہیں —!" صفدر خان دہاڑا۔

ایک کوڑھی اپنی پوٹلی کھولنے لگا — صفدر خان پوٹلی کو آگ کے نزدیک کھینچ لایا — اس میں چار پانچ کلو آٹا رکھا ہوگا — اس کے اوپر کچھ پیاز اور دو تین باسی روٹیاں رکھی ہوئی تھیں —!

صفدر خان نے روٹیوں پر کسی درندے کی طرح جھپٹا مارا۔ میڈیکل کالج کے دونوں طالب علموں نے اپنی آنکھیں حقارت سے بند کر لیں۔

"بہت اچھی ہیں —!" صفدر خان نوالہ نگلتے ہوئے بولا۔

"اور کیا ہے تمہارے پاس — تم بھی اپنی پوٹلی کھول دو —" وہ دوسرے کوڑھی سے مخاطب ہوا — اس نے اپنی پوٹلی کھول دی — اس میں کچھ مونگ کی دال اور تین سنگھاڑے رکھے ہوئے تھے —!

"ابا — اب اس کوٹھے میں موت بھی آجائے — تو کوئی غم نہیں — اے لڑکی! اُٹھو اور آٹا گوندھو۔"

پھولداد شال ہل کے رہ گیا — !

"صفدر — !" سب انسپکٹر بے حد سپاٹ لہجے میں بولا — "یہ کام تمہیں خود ہی کرنا ہوگا — یہاں تمہارے سوا اور کوئی اس آٹے کو ہاتھ لگانے کے لئے تیار نہیں — !"

"اچھا — یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ لیکن انھیں کچھ نہ کچھ تو کھانا ہی چاہیئے زندہ کیسے رہ سکیں گے — !"

"تم کھاؤ — !"

"میں —" یکایک اس کا چہرہ تاریک پڑ گیا — پھر نہایت دھیمی آواز میں بڑبڑایا — "مجھے تو مرنا ہے۔ لگتا ہے —"

"ہاں — اسی لئے تمہیں زندہ رہنا ہے — تم مر گئے تو پھانسی کس کو لگے گی؟!"

"پھانسی.... !" وہ سسک پڑا۔ اس کے دونوں ہاتھ آٹے سے اٹے گئے تھے — وہ دوزانو جھکا ہوا گہری نظروں سے آٹے کو دیکھتا رہا۔ پھر یکایک اس نے اپنا منہ آٹے میں چھپا دیا —

تھوڑی دیر بعد وہ اسی حالت میں پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا — !

برف — برف اور صرف برف — برف کے سوا کچھ بھی نہیں —

تین دن تین رات لگاتار برفباری ہوتی رہی —

صفدر خان کے سوا ہر چہرے سے دہشت ٹپک رہی تھی — کوٹھے میں یہ چوتھی رات تھی — اور مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میں صدیوں سے اس کوٹھے میں پڑا ہوا ہوں — سیاہ چھت، منحوس اندھیرا — صرف دل کی دھڑکنیں سنائی دے رہی تھیں — موت — جو زندگی سے اس قدر نزدیک ہو کر بھی دور تھی۔

برف اور زیادہ گرے گی، ہوا اور زیادہ سرد ہو جائیگی — اور رگوں میں دوڑتا ہوا خون یکایک جم جائے گا — تب نہ بھوک کا احساس رہے گا اور نہ سردی کا — سب کچھ ختم ہو جائے گا — ایک روٹی کا سوال تھا — !

زندگی مسکرا پڑتی ——!

لیکن روٹی کوڑھیوں کے پاس تھی ——!! زندہ رہنے کے لئے ایک روٹی کی ضرورت تھی۔ لیکن روٹی پر موت کی ان دیکھی پرچھائیاں رقص کر رہی تھیں —— چولہا سرد پڑتا جا رہا تھا —— کوٹھا اندھیرے میں ڈوبتا چلا جا رہا تھا ——!

ان چاروں میں صرف صفدر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دکھائی دی تھی؛ وہ کوڑھیوں کو بھی کھلاتا اور خود بھی کھاتا —— لیکن مجھے اس وقت ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اگر میں نے ہتھیار نہیں ڈال دیئے تو وہ آگ جو میرے معدے میں لگی ہوئی ہے تھوڑی دیر کے بعد سارے جسم میں پھیل جائے گی۔

میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ کوڑھیوں کی طرف کھسکنا شروع کر دیا —— وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ لگ کر سو رہے تھے ——! یا جاگ رہے تھے ——!!

میں نے پوٹلیوں کی طرف ہاتھ بڑھایا —————— لیکن وہ چاروں روٹیاں غائب تھیں جو شام کے وقت صفدر خان نے نا تو ہونے کی بنا پر رکھ چھوڑی تھیں ——!

میرے ہاتھ آٹے میں دھنس کر رہ گئے ——!

دفعتاً میرے قریب سرسراہٹ سی ہوئی ——!

"جیسے کوئی جاگ رہا ہے ——" یہ سرگوشی اس جگہ سے ابھری تھی جہاں وہ دونوں میڈیکل کالج کے طالب علم رہتے تھے ——! پھر ایک دم خاموشی چھا گئی —— میں واپس اپنی جگہ کی طرف رینگنے لگا —— اچانک میں کسی سے ٹکرا گیا ——!

"ک... کون ——؟"

"میں......" میں نے انسپکٹر کی سرگوشی مشکل سے ہی سن سکا۔ میں مسکرا پڑا۔

"انسپکٹر صاحب! —— وہاں کچھ بھی نہیں —— روٹیاں اڑا لی گئی ہیں ——"

شاید انسپکٹر بھی مسکرا پڑا تھا ——!

دوسری صبح ہمارے لئے نہایت خوشگوار ثابت ہوئی —— اکبر، آغا گونزھے

میں خاص مہارت رکھتا تھا ــــــ روٹیاں بے حد لذیذ ثابت ہوئیں۔ اور مونگ کی دال، جو خالص پانی پر پکائی گئی تھی ــــــ اُن سے بھی زیادہ لذیذ ــــــ لیکن اُن دونوں ماں بیٹوں نے آج بھی ٹھنڈے پانی سے ناشتہ کیا ــــــ شاید عورتوں کو بھوک بہت کم لگتی ہے ــــــ!

شدید سردی اور سفر نے زخموں کی وجہ سے اُن دونوں کوڑھیوں کی حالت ہر پل خراب ہوتی جا رہی تھی ــــــ وہ دونوں کھاتے بہت کم تھے اور آنسو زیادہ بہاتے تھے۔ ایک کو زبردست بخار نے آگھیرا تھا ــــــ دوسرا اپنے زخم کھول اور اُن کی ٹیس بھول کر اُس کی تیمارداری میں لگا ہوا تھا ــــــ اور ہم سب ایک ذرا فاصلے سے تڑپ تڑپ جاتے تھے۔ لیکن زنجیریں بار بار جھنجھنا اٹھتی تھیں ــــــ!

آج کی رات بے حد سرد اور تاریک تھی ــــــ برف باری گو تھم چکی تھی، لیکن سردی بڑھتی جا رہی تھی ــــــ چاروں طرف سناٹا تھا ــــــ یکایک ایک زوردار تڑاخ ہوا ــــــ اور پھر گہری خاموشی چھا گئی ــــــ!

"یہ کیا تھا ــــــ!" سب انسپکٹر جھٹ سے بولا۔

"گولی کی آواز ــــــ!"

"گولی ــــــ اس جنگل میں ــــــ اتنی رات گئے ــــــ گولی ــــــ اس کا مطلب ــــــ یعنی کوئی انسان ــــــ ممکن ہے کہ ہمیں تلاش کیا جا رہا ہو!؟"

اس کا سارا جسم کان بن کر باہر کی آواز سننے لگا ــــــ ہم سب سانس روکے دم سادھے بیٹھے تھے۔ مگر باہر مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی ــــــ کہیں کوئی پتہ بھی نہیں کھڑک رہا تھا ــــــ!

"شاید واہمہ تھا" ــــــ سب انسپکٹر بولا۔

"نہیں ضرور کوئی بات ہے ــــــ کیوں نہ باہر نکل کر دیکھا جائے ــــــ!"

باہر گہری تاریکی میں برف کی سفیدی کی وجہ سے ملگجی سی چھا رہی تھی ــــــ ڈھلان کے آخری سرے پر دھند پھیل رہی تھی ــــــ ٹھیک جس حصے میں ڈھلوان سے سڑک گزر رہی تھی اس جگہ بے شمار روشنیاں نظر آ رہی تھیں ــــــ ہم سے ٹھیک پانچ سو فٹ

اونچائی پر —!

سب انسپکٹر نے ریوالور نکال کر ہوا میں ایک فائر کر دیا —!

دوسری طرف ڈھلوان سے بھی ایک ساتھ کئی فائر ہوئے —!

جس میں ایک منحوس سناٹا چھایا ہوا تھا —

بس ڈرائیور ہر بار اپنی مونچھوں کی طرف ہاتھ لے جا رہا تھا —

صفدر خان بند کھڑکیوں کے شیشوں کو گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا —!

دونوں سپاہی اونگھ رہے تھے —!

سب انسپکٹر سگریٹ پر سگریٹ پھونک رہا تھا —!

نیلی آنکھوں میں زندگی جاگ رہی تھی —!

بڑھاپے کے چہرے پر اطمینان تھا —!

میڈیکل کالج کے دونوں طالب علم سیٹی میں کوئی انگریزی دھن بجا رہے تھے!

بس تیز رفتاری کے ساتھ دھند کا سینہ چیرتی ہوئی سری نگر کی طرف جا رہی تھی!

میں نے مڑ کر دیکھا —!

آخری سیٹ خالی تھی —!!!

ڈی کے کنول

انعام

جب بوڑھے قادر بخش نے مسٹر ڈیوڈ کو پہلگام کے اڈے پر دیکھا تو اس کا دل دھک سے ہو گیا۔ اس نے پہلی ہی نظر میں اسے پہچان لیا۔ اس کی بھیانک صورت دیکھ کر اس کا تن [illegible] سنسنا کر رہ گیا۔ خوف کے مارے ٹانگیں کانپنے لگیں اور چہرے پر زردی چھا گئی۔

"تمہارا گھوڑا ہے نا۔۔۔؟" مسٹر ڈیوڈ نے (جو قادر بخش کو پہچان نہ پایا تھا) اپنے مخصوص لہجے میں اس سے پوچھا۔

قادر بخش کی زبان گنگ ہو چکی تھی۔ انگ انگ جیسے زخموں سے دکھنے لگا تھا۔ آج سے برسوں پہلے کا منظر اس کی آنکھوں کے آگے لہرانے لگا تھا۔ وہ منظر ——— جب وہ بیس بائیس برس کا ایک کھلنڈرا نوجوان تھا۔ کیا بے فکری کے دن تھے وہ ——— وہ سوچنے لگا ——— نہ کسی چیز کا غم نہ کسی بات کی پرواہ ——— وہ علی الصبح گھر سے نکلتا اور اپنے سفید گھوڑے ——— "موتیا" کو سرپٹ دوڑاتے ہوئے پہلگام کے بس اڈے پر پہنچ جایا کرتا۔ یہی پہلگام کی وادی تھی۔ سرسبز و شاداب زمرد سے بھری تھالی کی مانند۔ یہی جنگل، یہی کوہسار اور یہی نالہ لیدر۔ چنگھاڑتا ہوا۔ بظاہر کچھ نہ بدلا تھا۔ ندی نالے، جنگل و بیابان، وادیاں اور کوہسار جوں کے توں موجود تھے۔ البتہ وہ بدل گیا تھا۔ آج سے تیس برس پہلے وہ جوان تھا۔ کنوارا تھا۔ لیکن اب تو وہ نہ ہی کنوارا تھا اور نہ ہی جوان ——— اس کے لڑکپن کے دن نہ رہے تھے۔ اس کی جوانی نہ رہی تھی۔ وہ زندگی کے تیس برس پیچھے چھوڑ کے آیا تھا۔

وہ اب بوڑھا ہو چکا تھا۔ بڑھاپا دیمک کی مانند اس کی زندگی کو اندر ہی اندر چاٹ رہا تھا۔ اُسے گھن لگا رہا تھا۔ اُس کے سر کے آدھے بال سفید ہو چکے تھے۔ بازوؤں میں وہ سکت نہ رہی تھی۔ اب اُس سے گھوڑے کے پیچھے دوڑا نہ جاتا تھا۔ دو قدم چلنے سے سانس پھولنے لگتی تھی۔

تیس برس پہلے مسٹر ڈیوڑ سے قادر بخش کی ملاقات اسی جگہ پر ہوئی تھی اُسے گھوڑا چاہیے تھا۔

"آپ کو گھوڑا چاہیے صاحب ہے؟"

"ہاں! ہم تمہارا گھوڑا مانگتا ہے۔"

"آئیے میرے گھوڑے پر بیٹھ جائیے۔" قادر بخش گھوڑے کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ "یہ اول نمبر (نمبر) کا گھوڑا ہے صاحب۔ اول نمبر کا۔"

وہ حسبِ عادت اپنے گھوڑے کی صفتیں بیان کرنے لگا۔

جب مسٹر ڈیوڑ گھوڑے پر بیٹھ گیا تو قادر بخش نے اس کا بیگ سنبھال کر پوچھا۔

"کہاں لے چلوں صاحب؟"

"شکار گاہ۔"

"بہت اچھا صاحب۔"

قادر بخش گھوڑے کی لگام تھام کر آگے آگے چلتا رہا۔ جب انہوں نے لبدر کا پل پار کیا تو مسٹر ڈیوڑ گھوڑے کی لگام خود سنبھال کر اُسے دوڑانے لگا۔ تھوڑا سا دور چل کر مسٹر ڈیوڑ نے گھوڑے کو چابک دکھایا۔ گھوڑا گھبرا کر یوں بدک گیا کہ مسٹر ڈیوڑ کے لئے اُسے قابو کرنا مشکل ہو گیا۔ مسٹر ڈیوڑ مشاق سوار نہ تھا۔ اُس کا توازن بگڑنے لگا۔ ایک جگہ گھوڑے نے اچھل کر اس طرح چھلانگ ماری کہ مسٹر ڈیوڑ لڑھک کر نیچے گر پڑا۔ نیچے کچی زمین نہ ہوتی تو ہڈیاں چور چور ہو جاتیں۔ ہڈیاں تو بچ گئیں البتہ جسم میں کئی چوٹیں آئیں۔ وہ کراہتا ہوا اٹھا اور ایک سایہ دار کے پیڑ کے تنے سے لگ کر بیٹھ گیا۔ قادر بخش ہانپتے کانپتے مسٹر ڈیوڑ کے پاس پہنچا

تو اُسے دیکھ کر مسٹر ڈیوڈ کی آنکھیں شعلہ بار ہوگئیں۔ خون کھول کھول اُٹھا اُس کا۔
اُس نے زمین پر پڑا ہوا چابک اُٹھایا اور قادر بخش سے بغیر کچھ کہے سنے تڑاخ تڑاخ
اُس پر چابک برسانے لگا۔ جب قادر بخش کی ننگی پیٹھ پر چابک پڑا تو وہ بلبلا اُٹھا
اُس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا اور وہ چکرانے لگا۔ مسٹر ڈیوڈ غصّے میں اس
قدر بھرا ہوا تھا کہ اس نے چابک سے قادر بخش کے جسم کو لہولہان کر دیا۔ قادر بخش
چیختے چلاتے ہوئے زمین پر لوٹتا رہا اور اسی کے ساتھ بے ہوش ہوگیا۔

دو گھوڑ بانوں نے اُسے اسی حالت میں گھر پہونچا دیا۔ گھر میں کہرام
مچ۔ اس کی ماں زونی اپنے بال نوچنے لگی۔ اپنے سینے پر دو ہتّڑ مار مار کر رونے لگی

جب قادر بخش کو ہوش آیا تو اُس نے اپنے آپ کو گھر کی تنگ و
تاریک کوٹھری میں پایا۔ زونی اُس کے سرہانے بیٹھی رو رہی تھی۔

"کیا اس شب کی کبھی سحر نہ ہوگی ——؟" قادر بخش نے انتہائی حزین
لہجے میں اپنے آپ سے پوچھا۔

رات ہو چکی تھی —— تیرگی نے اُجالوں کو نگلا کر کھدیا تھا۔ ہر طرف
تاریکی اور عجاں ایوا سناٹا تھا۔ فضاؤں میں جیسے سانپ لہرا رہے تھے۔
لمبے کالے سانپ ——

اس شب کی سحر ہوگی۔ ضرور ہوگی اور ہر آنے والی صبح کا اُجالا اندھیرے
کو نگل ڈالے گا ——" وہ اپنے آپ کو تسلیاں دینے لگا۔ مایوسیوں اور
ویرانیوں کے کفن پر اُمید اور آرزوں کے گل بوٹے سجانے لگا۔

زونی ایک پیالی میں مرہم بنا چکی تھی۔ زونی جو بہت دیر سے
رو رہی تھی اپنے آنسو پونچھ کر اس کے زخموں پر مرہم بھرے پھاہے رکھنے لگی۔

اس واقعہ کو برسوں بیت چکے تھے —— آن دنوں وہ غلام تھا
محکوم تھا، مظلوم تھا —— لیکن اب وہ آزاد تھا۔ خود ہی حاکم تھا، خود ہی آقا تھا
"شکارگاہ چلوگے ——؟" مسٹر ڈیوڈ نے قادر بخش کو جھنجھوڑتے
ہوئے پوچھا۔

قادر بخش اپنے آپ میں لوٹ آیا۔ اپنے مضمحل بدن کو اپنے

سفید پیرن کے نیچے چھپاتے ہوئے اس نے پھسی پھسی آواز میں کہا۔

"ہاں ہاں چلوں گا صاحب! ضرور چلوں گا۔ آپ گھوڑے پر بیٹھ جائیے"

مسٹر ڈیوڈ نے اپنا بیگ، قادر بخش کے ہاتھوں میں تھما دیا اور خود گھوڑے

پر بیٹھ گیا۔

قادر بخش کا مریل گھوڑا خراماں خراماں چلنے لگا۔ کہاں موتیا جو چابک

دیکھ کر ہی ہوا سے باتیں کرنے لگتا تھا اور کہاں یہ مریل گھوڑا جو ڈنڈے کھا کر بھی

اُس سے مس نہ ہوتا تھا۔

دوپہر کو وہ مسٹر ڈیوڈ کو لے کر واپس اڈے پر پہونچ گیا۔ اس کا

دم پھولا ہوا تھا۔ جسم پسینے سے شرابور ۔۔

"تمہارا گھوڑا بہت اچھا ہے۔ بہت اچھا ہے ۔۔" مسٹر ڈیوڈ

گھوڑے سے اترتے ہوئے بولا۔

اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر دس دس کے کئی نوٹ نکالے اور

انہیں قادر بخش کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

"یہ لو ۔۔"

"یہ کیا ہے صاحب ۔۔؟"

"یہ تمہارا بخشش ۔۔ تمہارا انعام ۔۔ ہم تم سے بہت خوش ہے

تم کو بخشش دیتا ۔۔"

بہت سارے نوٹ دیکھ کر قادر بخش کا ایمان پل بھر کے لیے

ڈانواڈول ہو گیا۔ تبھی اس نے نوٹ لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا اسے کچھ یاد آ گیا۔

اسے ایک جھٹکا سا لگا۔ بڑھتا ہوا ہاتھ رک گیا ۔۔ اس نے تحقیر آمیز نظروں سے

مسٹر ڈیوڈ کو دیکھا اور پُر جوش لہجے میں بولا:

"ہم بھیک نہیں لیتے صاحب ۔ ہم غریب سہی لیکن بے غیرت نہیں۔

ہم اپنی مزدوری لیتے ہیں خیرات نہیں ۔۔ سمجھے ۔۔"

قادر بخش کا یہ جواب سن کر مسٹر ڈیوڈ سکتے میں رہ گیا — اسے یوں لگا جیسے قادر بخش نے اسے گالی دی ہو — اس کی توہین کی ہو — اسے سرِعام ننگا کر دیا ہو — اس نے دس کا ایک نوٹ قادر بخش کی طرف پھینک دیا اور اپنے پیر پٹختے ہوئے چل دیا۔

قادر بخش دس کا نوٹ ہاتھ میں لئے فاتحانہ انداز میں کھڑا رہا۔

نجات

آئینوں کے بھرے سمندر میں
اِک انا جاگتا جزیرہ ہے
اور جزیرے میں یوں کھڑا ہوں میں
پانیوں میں بفیضِ عکسِ تمام
ڈوبتا اور ابھرتا رہتا ہوں
ٹوٹتا اور بکھرتا رہتا ہوں!!
..... ——— ..
آئینوں کے بھرے سمندر میں ●

محمد فاروق مضطر

شمس الدین شمیم

پھاوڑے کی بیٹی

"آج اُسے ہم نہیں چھوڑیں گے..... نہیں چھوڑیں گے۔"

"یہ ہمارے جھاڑو اور پھاوڑے روز روز کوڑا کرکٹ میں کیوں چھپا دیتا ہے؟"

"کتے کا سالا!"

"اِس نے تو ہماری ناک میں دم کر رکھا ہے۔"

"آخر گُلہ میر اپنے آپ کو کیا سمجھتا ہے؟"

"بیٹا لوگوں کو ستائے لیکن باپ پر جوں تک نہ رینگے۔"

ہفتے میں دو یا ایک بار محلے کے تمام خاکروب گُلہ میر کے مکان پر دھاوا بول کر موٹی موٹی گالیاں دینے لگتے کیوں کہ گُلہ میر کا شریر بیٹا ظہور اس محلے میں رہنے والے خاکروبوں کے جھاڑو اور پھاوڑے ایک ویران احاطے کے کوڑا کرکٹ میں چھپا دیتا اور انہیں تنگ کرتا۔ جس کی وجہ سے تمام خاکروب ٹوٹے پھاوڑوں اور لاٹھیوں سے لیس ہو کر زبردست ہنگامہ کھڑا کر دیتے مگر کبھی کبھار علاقے کا جمعدار نیلی کنٹھ خاکروبوں کو روکتا تو خاکروب اسے تنکے کی طرح دور پھینک دیتے اور زبردست ہنگامہ شروع کرتے۔ ہنگامے کا تماشہ قرب و جوار کے محلے والے بھی دیکھتے تھے۔ لیکن یہ ہنگامہ کریم بخش کی بیٹی نوری کے لئے قیامت بن جاتا۔ ہنگامے کے وقت اُس کی حالت پاگلوں جیسی ہو جاتی۔ اُس کے ابھری سیب جیسے رخساروں

پر آنسو ڈھلک کر رہ جاتے تو وہ بے چین سی ہو جاتی اس کے تن دنوش میں اُسی طرح ارتعاش پیدا ہو جاتا جس طرح ایک خاموش جھیل میں کنکر پھینکنے سے ارتعاش پیدا ہو جاتا ہے۔

وہ ایک عجیب سی لڑکی تھی۔ بے حد حسین گونگے ہونٹ، سیاہ موٹی موٹی آنکھیں، متوازن جسم، نکھرا ہوا رنگ، مخروطی انگلیاں اور بے حد شرمیلی کسی کی طرف دیکھتے ہی چہرے پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں تھرتھرانے لگیں جس سے اُس کا حسن اور نکھر جاتا۔ ہر شخص کو یہی احساس ہوتا تھا کہ نوری بھولے سے خاکروب کے گھر میں پیدا ہوئی ہے وہ ایک ہیرا تھی جو کیچڑ میں پھنس چکا تھا۔ محلے میں جتنے بھی خاکروب رہتے تھے اُن کے سب لڑکے لڑکیاں بے علم تھے لیکن نوری کو پڑھنے سے دلچسپی تھی۔

لڑکے دن بھر گردن کے گرد سرخ سکارف باندھے منہ میں پان سگریٹ دبائے آوارہ گردی کرتے اور لڑکیاں دن بھر سولہ سنگار سے اپنا دل بہلاتیں۔ اُن کے پاس وقت کی کوئی قدر نہیں کوئی قیمت نہیں وہ کسی کا احترام کرتے اور نہ عزت انہیں اپنے مستقبل کا کوئی خیال نہیں کوئی غم نہیں تھا۔ لیکن نوری ان سب سے بالکل الگ تھلگ تھی۔ اسے ہر لحاظ سے انفرادیت اور جاذبیت حاصل تھی۔ بچپن سے ہی تعلیم حاصل کرنے کا ذوق و شوق تھا۔ حالانکہ اُس کی ماں زرتی اُس وقت دمہ کی بیماری سے مر چکی تھی جب نوری صرف چار سال کی تھی ———

زندگی کے پلڑے برابر کرنے اور اس کے نشیب و فراز سے مقابلہ کرنے کے لئے زرتی بھی ایک سکول میں چپراسی کا کام کر کے اپنے خاوند کا ہاتھ بٹاتی وہ نوری کو پڑھانا چاہتی تھی لیکن وہ زیادہ دیر زندہ نہ رہ سکی۔ اُس نے نوری کو اجلی اجلی وردی پہنے ہوئے اور کاندھے پر کتابوں کا چھوٹا سا بستہ لٹکائے ہوئے کبھی بھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ اسی ارمان کو دل میں لئے آخری ہچکی لینے کے وقت کریم شیخ سے بولی تھی۔

"نوری کو پڑھا کر ہیڈ استانی بنانا۔"

یہ بات کریم شیخ کے ذہن کے پردے پر منقش ہو گئی اور اُس نے صفائی کا کام کرنے کے علاوہ محلے کے نکڑ پر جوتوں کی مرمت شروع کر دی۔ اور کافی جدوجہد و محنت مزدوری کر کے نوری کو پڑھاتا رہا۔ نوری کی اعلیٰ ذہانت، تدبر، سلیقہ شعاری،

سنجیدگی اور رقتِ طبیعت ہمیشہ پیرالنساء سنتے محلے کے تمام طبقوں کی لڑکیوں کا کردار ایک انوکھا تھا
اور خود اس کی ماں کا کردار چاند تھا۔ اگرچہ لوگوں کی زبان پر اس کی تابِ تقلید شرافت، اور عالی ظرفی
تھی لیکن اس کے باوجود جیسے گندی نالی کا ایک حقیر کیڑا تصور کرتے تھے اسے وہ جوہڑ
سمجھتے تھے جو گندے --- پانی سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔ جب نوری نے میٹرک کا امتحان پاس کر کے
کالج میں داخلہ لیا تھا تو پہلے ہی دن کالج کے احاطے میں لڑکیوں کے طنز بھرے نقرے
اس کے کانوں میں زہر گھولنے لگے تھے۔

"لڑکیو! اب فکر کی کوئی بات نہیں صفائی کا کام اب ہوتا رہے گا"
"ارے پروین سنو! سینڈلوں اور چپلوں کی مرمت بھی ہوا کرے گی"
"ہوسٹل بھی صاف ستھرا ہوا کرے گا"

یہ نقرے کسنے کے بعد طالبات نے ہوائی قہقہے بلند کئے تھے۔ پہلا طنزیہ
نقرہ نوری کے محلے کی ایک طالبہ زلفی نے کسا تھا جو سید خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ زلفی کبھی
راکھی اور کبھی ہیما مالنی کے انداز سے چلتی تھی اور اکثر سینما گھروں کا طواف کیا کرتی تھی۔

زلفی کا نقرہ نوری کے دھڑکتے ہوئے دل میں ایک تیز رفتار تیر کی طرح
چبھ گیا اور وہاں ایک تلاطم سا اٹھ گیا جو بعد میں دھیرے دھیرے اس کے سارے
بدن میں زہر بن کر پھیل گیا وہ کانپنے لگی۔ اس کے عنابی رنگ کے گونگے ہونٹ تھرتھرانے
لگے۔ لیکن دیوار کا سہارا لے کر اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور طعنوں کے تیر کالج میں ہر
لمحے اپنے نازک دل پر برداشت کرتی رہی، سہتی رہی اور ٹالتی رہی۔

خاکروبوں کی لڑائی کے وقت اس کے کان پھٹنے لگتے وہ گارے کی بوسیدہ
جھونپڑی کے ایک کونے میں سہم کر --- سمٹ کر رہ جاتی اس کے سامنے لامحدود تاریکیاں
ہی تاریکیاں چھا جاتیں فرطِ احساس سے اس کے گونگے ہونٹوں پر ایسے بے انتہا خراشیں
پڑ جاتیں جیسے دھوپ میں سکھائی جانے والی مچھلیوں پر خراشیں پڑ جاتی ہیں۔ اس کا دل تڑپ
کر رہ جاتا اور ذہن کے آبگینوں میں کھلبلی سی مچ جاتی۔ جونہی کبھی اس کا باپ کریم بخش دیگر
خاکروبوں کی لڑائی جھگڑے میں حصہ لینے کے لئے کاندھے پر پھاوڑا رکھ کر گارے کی
جھونپڑی سے باہر آتا تو نوری بلک بلک کر آنسو یا دن پڑتی اور کہتی۔

"بابا تم مت جاؤ۔ لوگ کیا کہیں گے؟"

"لڑائی جھگڑا کوئی اچھی بات نہیں۔"

"میں چاہتی ہوں تمام خاکروب مہذب بنیں ——"

"پڑھیں لکھیں، لیکن تم لوگ سمجھتے ہیں۔"

"تمہیں میری قسم اگر تم بھی لڑائی جھگڑے میں شرکت کرتے رہو گے تو جانتے ہو کیا ہوگا؟ میں ایک دن گھٹ گھٹ کر مر جاؤں گی۔ بابا مجھ میں یہ دکھ برداشت کرنے کی طاقت نہیں ہے، بابا تم مت جایا کرو۔"

یہ کہتے کہتے اس کی موٹی موٹی سیاہ آنکھوں میں سرخ سرخ ڈورے پھیل جاتے اور کریم شیخ پھاوڑا کونے میں پھینک کر نوری کو سنبھالتا۔ اسے دلاسہ دیتا اور لڑائی ہنگامے میں شرکت نہ کرنے کا وعدہ کرتا۔

نوری کو کبھی کسی نے جھونپڑی کے باہر دھوپ سینکتے ہوئے نہیں دیکھا تھا وہ کبھی بھی اپنی ایک منزلہ بوسیدہ جھونپڑی کی کھڑکی کا پٹ کھول کر باہر نہیں دیکھتی، وہ محلے کی دوسری لوگوں اور خاکروبوں کی ماں بہنوں اور بہو بیٹیوں کی طرح دھوپ میں اپنے لمبے مکمل سیاہ بال کبھی بھی کھلے نہیں چھوڑتی۔ اسے بہت جھجک تھی، شرم تھی، احترام تھا۔ محلے کی کوئی عورت اگر اس کے پاس آتی تو بار حیا سے اس کی پلکیں بار بار جھک جاتیں۔ اور ایک حسین منظر وجود میں آتا ہر عورت اس کے کتابی چہرے کو دیکھنے میں محو ہو جاتی لیکن ساتھ ہی اسے نوری کے پھاوڑے، جھاڑو اور جوتے یاد آتے اور اسے پھر یکایک نوری کا کتابی چہرہ بدصورت اور منحوس دکھائی دیتا۔

کالج جاتے آتے وقت محلے کے من چلے اور اوباش نوجوان اس پر طنز کستے اور اکثر کہا کرتے تھے۔

"ارے بھئی انور صاحب اب پڑھنا دڑھنا چھوڑ دو۔"

"بہتر یہی ہے کہ میونسپلٹی جوئین کرو۔"

"ہاں یار! نوری صاحبہ کو جمادار بنا دیا جائے گا۔"

نوری یہ سن کر آہ تک نہ بھرتی بلکہ خاموشی سے کالج جاتی اور وہاں سے

واپس آکر جھونپڑی کے اندر گھس کر تلاوتِ مطالعہ سے اپنا دل بہلاتی۔

ایک بار جب اُسے یہ محسوس ہوا کہ کریم شیخ اب زیادہ کام نہیں کر سکتا، وہ اب بالکل لاغر اور بوڑھا ہو چکا ہے تو اُس نے محلے کی چھوٹی چھوٹی لڑکیوں کو پڑھانے کا سلسلہ شروع کیا۔ لیکن یہ سلسلہ صرف چند دن تک ہی جاری رہا۔ کیوں کہ ان ہی کے والدین نے کہا۔

"ایک نیچ ذات کی لڑکی ہماری بچیوں کو کیا درس دے سکتی ہے؟"

"یہ ہماری بے عزتی ہے۔"

"ہم بچوں کو کوڑا کرکٹ میں نہیں پھینکیں گے۔"

"نوری کیچڑ ہے اور اس کا مقام کوڑا کرکٹ ہے۔"

جب یہ باتیں نوری نے سنیں تو ایک بار پھر اُس کے جذبات کچل کے رہ گئے۔ اسے اپنا وجود اور ہستی گندی نالی کے کیچڑ سے بھی زیادہ بدتر دکھائی دی وہ اپنے کانٹوں بھرے ماضی کی راہ گزر، حال کی پیچیدگیوں اور مستقبل کی تاریکیوں کو کوسنے لگی۔ بعض اوقات وہ شدّتِ غم سے تنگ آکر اپنی ہستی اور وجود کو مٹانے پر تیار ہو جاتی۔ لیکن ضمیر اُسے ایسا کرنے سے روکتا۔ کبھی کبھی وہ کتابوں میں مساوات، برادری، اخوت اور محبت سے متعلق مضامین پڑھ کر حیران رہ جاتی اور گھنٹوں سوچتی رہتی کہ جب کتابوں میں ایسا لکھا ہے۔ قرآن شریف نے مساوات کا درس دیا ہے تو پھر کیوں لوگ، سماج اور دُنیا مجھے نیچ سمجھتی ہے، کیوں سماج میں میرے لئے کوئی جگہ نہیں۔؟

نوری کے بی اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد کریم شیخ ایک روز جب شام کو گھر آیا تو اُس نے جوتوں کی مرمت کا سامان، جھاڑو، پھاوڑا ایک کونے میں ڈال دیا اور پھر جھونپڑی کی ریگ بستہ دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اتنے میں نوری اس کے قریب آئی اور پاؤں دبانے لگی۔ کریم شیخ نے تھوڑا سا آرام کیا اور پھر نوری کے سر پہ ہاتھ پھیر کر بولا۔

"بیٹا اب تم نے خوب پڑھا، بہت زیادہ پڑھا۔ میں مرنے سے پہلے تمہاری شادی دیکھنا چاہتا ہوں۔ بس اب اس بڑھاپے میں صرف یہی ایک ارمان ہے، آرزو ہے، تمنا ہے، جانتی ہو تمہاری شادی کس کے ساتھ ہو رہی ہے۔"

کریم شیخ کا یہ جملہ سن کر نوری شرم کے مارے بے حال ہو گئی تاریخیا

سے اُس کے رخسار سرخ ہو گئے اور سارا بدن پسینے سے شرابور ہو گیا۔ وہ دوسرے کمرے میں شرم کے مارے بھاگ جاتی لیکن جھونپڑی میں دوسرا کوئی کمرہ تھا ہی نہیں بس یہی ایک کمرہ اُس کی ساری کائنات تھا۔

"جانتی ہو بیٹیا تمہاری شادی کس کے ساتھ ہو رہی ہے وہ ہے ناسد رشید کا بیٹا۔ علیا۔ وہ کل ہی نوکر لگا ہے۔ ایک دفتر میں۔ موٹی تنخواہ ملے گی۔ صفائی کا کام کرتا ہے۔ اور رہا سنو۔ وہ بڑے چوک کے نکڑ پر جوتوں کی مرمت کے عوض خوب پیسے کماتا ہے۔

علیا، دفتر میں نوکر۔

"صفائی کا کام"

"بے علم"

"بڑے چوک میں جوتوں کی مرمت"

یہ سن کر نوری گونگی ہو گئی، صرف اُس کی موٹی موٹی سیاہ آنکھوں نے احتجاج کیا۔ پپوٹے پانی سے لبریز ہو گئیں اور اشک کے قطرے رخساروں پر پھسل کر مٹی میں ٹپ ٹپ گر پڑے۔ اُسے یاد آیا کہ علیا اُسے کالج جاتے وقت بڑے چوک میں نظر بچا کر کہتا تھا۔

"نوری اتنی بے رخی کیوں۔ ایک دن ضرور دل کی رانی بنا دوں گا"۔

"میں تمہیں اپنا کر تمہاری ساری کتابوں کو جلا دوں گا"۔

"ارے میری گلنار ذرا ایک بار میری طرف تو دیکھ"۔

"کتابوں نے تمہیں مغرور بنا دیا ہے"۔

نوری چپ چاپ چلی جاتی اور دل ہی دل میں اس کم عقل علیا کو کوستی رہتی۔

باپ کی بات جب اُس نے سنی تو اس کے ذہن میں ایک انقلاب آ گیا اُس کی آنکھوں سے پانی بہتا رہا۔ لیکن وہ گونگی بنی رہی خاموشی سے دیکھتی رہی اُس کے پاس احتجاج کا کوئی راستہ نہ تھا۔ لیکن اس دن کے بعد کریم رشیو نے نوری کے سامنے کبھی بھی شادی کا کوئی ذکر نہیں کیا بلکہ وہ اس بہت بڑے سوال کو ذہن کے اندر ٹالتا رہا۔ کبھی

کبھی اُس کے ذہن میں سوالوں کا کہرام مچ جاتا۔ لوگوں کی باتیں گونجنے لگتیں۔

"نوری سیانی ہو گئی"۔

"خاکروب برادری تمہیں طعنہ دے گی"۔

"بیٹی کی عمر تیس سال ہونے والی ہے"۔

"بدبخت نے بیٹی کو گھر میں رکھا ہے"۔

لیکن اِن ساری باتوں کے باوجود کریم شیخ نوری کی شادی کا معاملہ ٹالتا رہا۔ اُس نے کوشش کی تھی کہ نوری کے لیے کوئی تعلیم یافتہ اپنی برادری میں ہی مِل جائے۔ لیکن کوئی نہ ملا۔ اپنی برادری سے باہر اگر کسی کے سامنے نوری کی شادی کا ذکر کیا تو لوگوں نے ہنسی اُڑائی، مذاق سمجھا۔ طعنے دیئے۔

"کریا تم اپنی اوقات بھول رہے ہو"۔

"تم تو خالص چمار ہو اور تمہاری دوڑ گندی نالی تک ......"

"نوری کو کسی خاکروب کے پلے باندھ دو اسی میں تمہارا بھلا ہے"۔

اِس صورتِ حال کو دیکھ کر کریم شیخ یہ سوال ٹالتا رہا۔ ٹالتا رہا اور یہی سوال اُس کے جسم میں زہر بنتا گیا اور انگ انگ میں پھیلنے لگا۔

اِس واقعہ کے پورے چار سال گزرنے کے بعد جب کریم شیخ زبردست بیمار ہوا اور اُس کی زندگی کا درخت خزاں رسیدہ ہو گیا تو اُس نے نوری کو بالکل اپنے قریب لا کر دھیمی آواز میں کہا۔

"بٹیا تم جانتی ہو! سماج اور دُنیا کی نظروں میں ہماری حقیقت گندی نالی کے حقیر کیڑوں سے بھی بدتر ہے"۔

"میرا دادا بھی بھاوڑے کا بیٹا تھا"۔

"میرا باپ بھی بھاوڑے کا بیٹا تھا"۔

"میں بھی بھاوڑے کا بیٹا ہوں"۔

"اور جانتی ہو تم بھی بھاوڑے کی بیٹی ہو۔ میں جانتا ہوں، تم نے علیا سے کیوں شادی نہیں کی"۔

"وہ بے علم ہے، جاہل ہے اور پست خیالات کا آدمی ہے۔ وہ تمہاری تعلیم سے نفرت کرتا ہے وہ تمہاری قدر نہیں کرتا۔"

تمہارے ساتھ کوئی بھی پڑھا لکھا نوجوان شادی کے لئے تیار نہیں تھا اس لئے میری ایک نصیحت یاد رکھو، تمہاری جوانی اب ڈھل چکی ہے۔ اسی جھونپڑی کی چار دیواری میں رہو اور تمام غاکر دبوں کی بچیوں اور بچوں کو پڑھاؤ انہیں تربیت دو انہیں تہذیب کا احساس دلاؤ راستہ دکھاؤ انہیں جہالت کے گھور اندھیرے سے باہر نکال لو اگر تمہارا خواب پورا نہیں ہوا تو تمہاری ذات کی نئی نسل کا خواب ضرور پورا ہو جائے گا اس نئی نسل کے لئے ایک نئی صبح طلوع ہوگی۔"

"ہاں۔ ایک نئی صبح طلوع ہوگی، ایک نئی صبح طلوع ہوگی"

کریم شیخ کی یہ نصیحت سن کر نوری نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا۔

"ہاں بابا میں تمہاری نصیحت پر ضرور عمل کروں گی۔ ضرور عمل کروں گی۔"

اور آج جب کہ نوری کے سر کے بال روئی کے گالے لگ رہے ہیں اور اس کا کتابی چہرہ ان گنت جھریوں کا نشیمن بن چکا ہے وہ ابھی بھی کنواری ہے۔ لیکن اس کے محلے کے تمام غاکر دبوں کے لڑکے اور لڑکیاں سکولوں، کالجوں میں پڑھ رہے ہیں۔ جن کو دیکھ کر نوری کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو آجاتے ہیں اور وہ اپنی فتح پر اطمینان کا سانس لیتی ہے۔

نصرت آرا چودھری

میں یونہی اپنے خیالوں میں ڈوبی کھڑکی میں کھڑی تھی کہ اچانک ایک دُکان سے شعلے اٹھنے لگے ۔۔۔ ایک آدمی جس کے کپڑوں میں آگ لگی ہوئی تھی گھبرایا ہوا باہر نکلا اور دیکھتے ہی دیکھتے بھڑکتے ہوئے شعلے برابر کے مکان کی چھت کو چھونے لگے اور اس کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ میں نے دوڑ کر فائر بریگیڈ کو ٹیلی فون کیا۔ اور اتنی دیر میں سینکڑوں آدمی ان جلتے ہوئے مکانوں کے گرد جمع ہو چکے تھے۔ ہر طرف ہاہا کار مچی تھی، عورتیں چیخ رہی تھیں۔ بچے رو رہے تھے۔ اور ہر پڑوسی کو فکر تھی کہ کسی طرح اس کا گھر محفوظ رہے۔

یوں تو آگ ایک دکان سے نمودار ہوئی مگر سب سے پہلے اس نے جس مکان کو اپنی لپیٹ میں لیا وہ ایک بیوہ کا مکان تھا۔ جس کی چار جوان لڑکیاں ایک ناقابل برداشت بوجھ بن کر اس کی زخمی چھاتی پر مونگ دل رہی تھیں۔ یہ دوسری آگ تھی جو اس کے گھر سنسار میں لگی۔ پہلی آگ اس روز لگی تھی جب اس کی شادی کے ٹھیک پانچ سال بعد اس کا چاہنے والا شوہر وطن کی حفاظت کرتا ہوا کسی مورچہ پر شہید ہو گیا تھا۔

آگ بجھانے والے انجن آ گئے۔ مگر لوگوں نے ان کے ہاتھوں سے پانی پھینکنے والے پائپ چھین لئے۔ ہر ایک کو یہی فکر تھی کہ کہیں بھڑکتے ہوئے شعلے ان کے مکانوں کو اپنی گرفت میں نہ لے لیں۔ وہ اس بڑھتی ہوئی آگ کو قابو میں کرنے سے پہلے اس کی ضمانت چاہتے تھے کہ ان کے گھر محفوظ رہیں۔

گھر جلتا رہا۔ اور وہ بیوہ بال بکھرائے ننگے پیر پھٹی پھٹی آنکھوں سے

ان بھڑکتے ہوئے شعلوں کو دیکھتی رہی، جو دوسری بار اسے پھونکنے چلے آئے تھے اس کی چار ننھی لڑکیاں چیخ چیخ کر رو رہی تھیں۔ پولیس آگئی۔ اور ان کے ہلکے سے لاٹھی چارج کرنے پر کچھ لوگ بھاگ کھڑے ہوئے۔ اور اس موقعہ کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک منچلے نے سب سے بڑی لڑکی کو مرتحا کہنی مار کر اپنا اخلاقی فرض پورا کر دیا اور پھر بجلی کے کھمبے کے نیچے کھڑے ہو کر اس نے اپنی بہادری کی داستان چٹخارے لے کر دوسرے دوست کو سنائی۔

آگ نے دائیں طرف کا موڑ لیا۔ اور پھر چیخ و پکار کا ایک اور طوفان...

وہ گھر کیا تھا۔ پورا گودام تھا۔ اوپر کی کھڑکی کھلی۔ اور وہاں سے قیمتی سامان نیچے پھینکا جانے لگا۔ مصیبت کا عالم تھا۔ ان کی مدد کے تلے بہت سے دوسرے لوگ بھی آگئے۔ اور نظر بچا وہ حق مزدوری کے طور پر اپنی من پسند چیز ادھر ادھر رکھنا بھولتے تھے جس کو وہ فرصت کے وقت لے کر لو دو گیارہ ہو سکیں۔

شعلے اور بھڑکنے لگے اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرا وجود جلنے لگا ہے۔ میں گھبرا کر اوپر ٹین کی چھت پر چلی آئی۔ آگ میری ایک سہیلی کے گھر تک پھیل گئی تھی۔ ابھی پچھلے ہی سال انہوں نے مکان بنوایا تھا۔ اب کیا ہو گا۔ کیا یہ سب کچھ جل کر راکھ ہو جائیگا۔

پانی کا پائپ چھینے پر ہاتھا پائی شروع ہو گئی۔ پولیس نے پھر ڈنڈے گھمائے اور ایک ڈنڈا اتفاقاً ایک لڑکے کو لگا۔ اس نے غصہ سے پولیس والے کی طرف دیکھا۔ اور اس کے ہاتھ سے ڈنڈا چھین کر ایک اس کے رسید کیا۔ سپاہی کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ مگر ہزاروں لوگوں کا مجمع دیکھ کر اس نے انتہائی بہادری سے راہ فرار اختیار کی۔

ایک دلدوز چیخ مار کر وہ بیوہ بے ہوش ہو گئی۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور مجھے ایسا لگا جیسے میں پھسل کر ان لپکتے ہوئے شعلوں میں جا پڑوں گی۔

مگر جیسے کسی غیبی ہاتھ نے مجھے سہارا دیا۔

اڑ اڑا دھم! دکان کی چھت گری لوگ بھاگ کھڑے ہوئے۔ بجلی کے کھمبے کے نیچے کھڑے ہوئے دوسرے دوست نے اس موقعہ کو غنیمت جان کر اپنی پچھلی سستی کا حساب برابر کر دیا۔ اس دفعہ اس نے دوسری دھکے کھاتی ہوئی لڑکی کے گالوں کا چھو لیا۔ اور دونوں دوستوں نے کھل کر قہقہہ لگایا۔ مگر دھواں حلق میں گھس جانے سے دونوں بے حالی

کھانسنے لگے: اور پھر کھانستے کھانستے ایک گلی میں گھس گئے

میرے بہن بھائی پانی کی بالٹیاں بھرے تیار بیٹھے تھے. اگر آگ ادھر کو رخ پھیرے تو ہم بھی اپنے گھر کی کھڑکیوں کو نم کریں۔

مگر اب ..... اب آگ بجھ چکی ہے. لوگ منتشر ہو گئے ہیں اپنے اپنے مکانوں کی فکر کرنے والے ہوشیار لوگ بھی اس وقت خواب خرگوشی کے مزے لوٹ رہے ہوں گے۔ بیوہ اور اس کی چاروں لڑکیاں اب کس کے رحم و کرم پر ہیں۔

میں تو یہ بھی پوچھنا بھول گئی۔ ان کے جلے ہوئے گھر میں ایک آدھ سلگتی ہوئی چنگاری اور دھوئیں کی ہلکی سی لکیر بھی پھیلی ہوئی چاندنی میں نظر آ رہی ہے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے، لوگ شکر کرتے ہوئے اپنے گھروں کو گئے تھے کہ آگ بجھ گئی ہے کیا واقعی آگ بجھ گئی ہے؟

نہیں۔ آگ ابھی تک نہیں بجھی۔ ہم سب جل رہے ہیں۔ ہم سب خود غرضی کے بھیانک شعلوں میں گھرے ہوئے ہیں۔ کیا کوئی ایسا آگ بجھانے والا انجن نہیں جو اس آگ کو بھی سرد کر دے ________________!

مالک رام آنند

بن پتوں کے پیڑ

ایک کہانی برسوں سے میرے ذہن کی کوٹھڑی میں تاریکی، حبس اور گھٹن سے چور چور سسک رہی تھی لیکن میں اس کو دِل کے کسی چوراہے پر پھانسی نہیں دے سکتا تھا۔

پھر اب آپ ہی بتایئے اس پھانسی کا ذکر میں کیسے کروں اور اس کہانی کے گلے میں الفاظ کی کونسی رسی اور اس کے چہرے پر درد اور عبارت کا کون سا نقاب ڈالوں تاکہ یہ کیفرِ کردار تک پہونچ سکے۔

کہانیاں بھی اپنے اندر ڈھیر سارا درد رکھتی ہیں۔ ان جانے ان بوجھے ان دیکھے یاد کے جکھڑ دل کو گرفت میں لینے کے لئے بے تاب رینگتے ہوئے نظر آتے ہیں جب کہ اور شانوں پر لپٹے ہوئے تیرگی اور کہرے کے یہ کفن آنکھوں کو آبدیدہ کردیتے ہیں۔ کوئی کیسے اس درد کو بیان کرے۔

اُس کے پانچ بچے تھے۔ ایک چھوٹی موٹی سی بیوی تھی اور زندگی کی گاڑی دھیرے دھیرے جیون پتھ پر ہکورے کھاتی گزر رہی تھی۔ اُس کے دماغ نے بھی چند سپنوں کے گھروندے بنا رکھے تھے۔ وہ انہیں چند سنہرے سپنوں کے لئے کبھی کبھی آپنے آپ سے بھی لڑنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ آخر وہ اس بےرحم سماج میں سوائے اپنے آپ سے لڑنے کے اور کر بھی کیا سکتا تھا۔ کیونکہ جب اِنسان کے سارے وسیلے سارے حیلے ختم ہو جاتے ہیں تو وہ اپنے

زیرپا ہو جاتا ہے۔

سرلا جب اس کی زندگی میں آئی تو وہ ایک معمولی سا ڈاکٹر تھا، معمولی تو وہ اب بھی تھا لیکن اپنے گنوں کی وجہ سے اس کے نام اور کام دونوں کی باہر کے دیسوں میں بہت گونج تھی وہ بیچارہ اپنے گھر میں اجنبی تھا۔ ہاں تو میں سرلا کی بات کر رہا تھا۔ گو سرلا ایک چھوٹے گھرانے کی لڑکی تھی لیکن اس نے ونے کے گھر میں آ کر واقعی اس کے چھوٹے سے کرایے کے فلیٹ میں زندگی کا پورا جوبن جگا دیا تھا۔

اس نے ونے کے گھر میں سب آسائش بھرنے کی جی توڑ کوشش کی تھی۔ آج وہ ایک معمولی سا ڈاکٹر نہیں دکھائی دیتا تھا۔ اس نے ترقی اور شہرت تو حاصل کر لی تھی لیکن سرلا کو وہ اچھی اچھی دوائیاں اور پھل خرید کر نہیں دے سکتا تھا۔ کیوں کہ سرلا آج پورے دس سال سے بیمار چلی آ رہی تھی۔ اس نے خود گھٹن اور مفلسی کے تھپیڑوں کو تو منظور کر لیا تھا اور ونے کو پانچ بچے بھی اپنی کوکھ سے نکال کر دے دیئے تھے، جن میں تین لڑکے اور دو لڑکیاں تھیں، سرلا اسی میں خوش تھی، ونے بھی کم خوش نہیں تھا۔ لیکن آپ جانتے ہی ہیں ڈھائی تین سو روپے میں اتنے بڑے کنبے کا پالنا آسان نہیں ہے اور یہی ایک سب سے بڑا غم تھا جو سرلا کو تو کھا ہی چکا تھا اب ونے کو بھی گھن کی طرح کھائے جاتا تھا۔

بچوں کو مناسب تعلیم کے لئے، ایکسٹرا ٹیوشن کے لئے خوراک کے لئے اور پھر اپنے ساتھ کے والوں میں تھوڑی بہت عزت کا بھرم رکھنے کیلئے اپنے آپ کو ان کے مقابلے پر نہ سہی ان جیسا بھی نبھانا ضروری تھا۔ اس کے سامنے نہ جانے کتنے نام تھے جو اپنی خوبصورت اور عقلمند بیویوں کی وجہ سے نہ جانے کتنی ترقی کی منزلیں طے کر رہے تھے اور جو کبھی اس کے رینک اور ساتھ کے جب وہ منسٹری میں آئے تھے۔ اس کے محکمے میں تو اس کے تلوے چاٹتے تھے، آج وہی آسمان سے باتیں کر رہے تھے۔ ان کی بیویاں صاحب لوگوں کے گھروں میں ٹی پارٹیوں، کاک ٹیل پارٹیوں میں اور خفیہ میٹنگوں میں حصہ لیتی تھیں۔ لیکن ایک وہ تھا کہ اپنی عزت، ناموس اور اخلاق کے بندھے ٹکے اصولوں کے ساتھ لپٹا ہوا چل رہا تھا

آج سے پانچ سال پہلے کی زندگی اور آج کی زندگی میں کتنا فرق ہے، نہ جانے کیا کیا کھو گیا ان برسوں میں۔ پھر یہ فرق تبھی محسوس ہوتا ہے جب غربت کا دیو سامنے

ہمارا ادب

کھڑا ہوا اور بڑی بوٹی نوچ لینے کو بیتاب نظر آتا ہو۔

آخر اس نے دنیا کو کیا دیا ہے۔ مفلسی، رنج اور غم، دکھ، تکلیفیں اور کبھی نہ ختم ہونے والی بیماری۔ آخر یہ جیون کیسا جیون ہے۔ انسان ہنس بھی تو نہیں سکتا، انسان رو بھی تو نہیں سکتا۔

وہ دفتر میں بھی یہی سوچتا تھا۔ وہ کام کرتے وقت بھی سوچتا تھا، کئی کئی بار اس کے اندر چھپی ہوئی کوئی دوسری شخصیت اس کے سامنے خود کر آ کھڑی ہوتی اور وہ خود فراموشی کے عالم میں اپنا سارا بدن، ساری سوچ اسے سونپ کر خود الگ تھلگ ہو کر بیٹھ جاتا تھا۔

وہ سوچتا، کڑھتا، گھٹتا آخر پھر وہ کیا کرے، بچے ہاتھ پھیلائے اس کے سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں، دوسرا کی دوائیوں کے بل اس کا منہ چڑانے لگتے ہیں، ساتھ والوں کے کھڑکتے چہرے، چکنے مکھڑے، اُن کے بے باک آواز سے ان کی بیویوں کی خوبصورت ساڑھیاں، ان کے گھر والوں کے رنگین قالین اور قیمتی فرنیچر، ریڈیو گرام، فریج، کلر ٹیلی ویژن سیٹ اور کاریں کچوکے لگانے لگتی ہیں۔

آخر انسان کی ہر خواہش کیوں ڈوب ڈوب جاتی ہے وہ کیوں پار نہیں اترتی؟ آخر ہم سب ایک جیسے ہی تو ہیں پھر یہ اونچ نیچ کیوں؟ ـ یہ فرق کیوں!؟

آخر وہ دن کب آئے گا جب سورج کی ہر کرن چاند کی مدھم چاندنی جیسی ٹھنڈی ہو، زمین پر قدم نہیں رکھے گا۔

وہ سوچتا اس کی آنکھیں تو ایک ساندی بن گئی ہیں۔ اس کی زندگی کی تمام دھوپ چھاؤں، ناامیدی، پژمردگی اور یاس دھرتی کے ریگزاروں میں کھو گئی ہے۔ یہ تڑپتی ہوئی، ایڑیاں رگڑتی ہوئی زندگی۔ زندگی کی اداس جھیلوں سے نہ جانے کتنی ہی ایسی ندیاں نکلتی ہیں جن کے بہاؤ میں حیات کی کشتی ایک ٹوٹے ہوئے پیڑ کے ٹھنٹھ کی طرح گہری غموں کے گرداب میں کھو جاتی ہے، ڈوب جاتی ہے اور پھر سب تارے سو جاتے ہیں، شفق مرجھا کر کسی گہری خندق میں گر جاتی ہے، سرو قد پیڑوں کے خنک سائے تمازت کے کہرے میں لپٹے ہوئے ریگزاروں کی خاک چھانتے نظر آتے ہیں۔ اس کے

کرب جیسے ہونٹ۔ پر خوشی کا کوئی گلاب کبھی کوئی شیریں بوسہ لیکر نہیں آتا۔ زمانے کی ناقدر شناسی سے بے لاگ رشتوں ناطوں کے تمام خوشگوار لمحے، پیار بھرے لمحے شکستہ سازوں کی بے ہنگم ڈپر درد موسیقی میں دم توڑ دیتے ہیں۔ آج سب آنکھیں پتھر کی ہو گئی لگتی ہیں، سب ہونٹ سبھی چہرے حیات کی ہر برگ پر ایک خزاں سا منظر پیش کرتے نظر آتے ہیں، جو وہاں ایک گھونسلہ بنا کر بیٹھ گئی ہے۔

جیسے آنسوؤں کا کال پڑ گیا ہو۔ کتنے ہی سورج سے چہرے سیاہیوں کے افق میں ڈوب رہے ہیں۔

پھر وہ ان کھیتوں کے متعلق سوچنے لگتا تھا، جن کو اس کے طفیل ایک نئی زندگی ملی ہے۔ اس کے وہ کامیاب تجربے، وہ نادر نسخے کتنے قیمتی ہیں، لیکن شاید چراغ تلے اندھیرا ہی رہے گا۔ آخر اس کی یہ ساری تعلیم، یہ ڈگریاں، ایگری کلچر کی دنیا میں انقلاب برپا کرنے والی تھیوریاں، کیا ان سب کو لیکر وہ چاٹے؟

وہ کتابی بس ہے وہ ایک ڈاکٹر ہے، ایک بہت بڑا ایگری کلچرسٹ ہے لیکن اس کے پاس زمین نہیں، زمین کیا دو چار گز جگہ نہیں جہاں وہ سر چھپا سکے، اس کے معصوم چھوٹے چھوٹے بچوں کے لئے ایک چھوٹا سا گھروندا ہی کھڑا کر سکے، اس کے سپنوں کا چھوٹا سا گھروندا جس میں اس کے انمول ان چھوے ان دیکھے سپنوں کی دنیا بس جائے۔

وہ دکھ اور درد کے گہرے کنویں میں بڑا بار بار سوچتا اور اس میں ڈوب جانے کی کوشش کرتا تھا۔ آخر اس کے بس میں ہی کیا ہے۔ اس کے سپنوں کا بھی تو کوئی تصور نہیں۔ پچھلے سال اس نے ایک تھیسس لکھا تھا، جس نے آسٹریلیا اور امریکہ جیسے ملک میں اس کے نام کی دھوم مچا دی تھی۔ لیکن وشے تقدیر، اس کے اپنے ملک میں اس کی سار لینے والا کوئی نہیں تھا، اس کے سارے خیالات، سارے افکار تاریکیوں میں گھٹ رہے تھے۔ اس کے بھیجے ہوئے گئے تمام تجربات کو اس کے اپنے ملک میں برت کر فائدہ اٹھانے والا کوئی نہ تھا۔ ابھی اس کے تجربات کو سراہ رہے تھے۔ اس کی خدمات حاصل کرنے کے لئے بیتاب ہو رہے تھے۔ لیکن اپنے دیش والے اس کا پیٹ بھر اناج بھی اس سے چھین لینا چاہتے تھے۔ اس کے بچوں کے نوالے، اس کے ارد گرد کے تمام نالے، مگر وہ گھناونے

چہروں والے جاہل گدھ چھیننے کے لیے پر تول رہے تھے۔ انجکشن، دوائیاں اور ڈھیر سارے
روپے سب باہر والے اس کی جھولی میں بھر دینا چاہتے تھے۔ سرلا چارپائی سے چپکی ونے
کو اپنے سیاہ حلقوں میں سمونے کی کوشش کرتی۔ وہ اس کے لئے ایک نوکرانی بھی تو نہیں
رکھ سکتا۔ کوئی بتائے دہلی جیسے اتنے بڑے شہر میں اتنے رنگ برنگے ٹھاٹھ باٹھ
والے ماحول میں ڈھائی تین سو روپے میں کوئی اتنے بکھیڑوں کے ہوتے ہوئے نوکرانی رکھ
سکتا ہے۔ فلیٹ کا کرایہ دے سکتا ہے۔ بچی کا ٹل کا کرایہ دے سکتا ہے۔ اس پر
اتنا بڑا کنبہ پھر جبکہ ترقی کے تمام راستے بند ہوں۔ اس نے کئی درخواستیں گزاری تھیں
لیکن پھر بھی شنوائی نہ ہو سکی تھی۔

وہ آگے بڑھنا چاہتا تھا۔ لیکن اس کو پیچھے دھکیل دیا جاتا تھا وہ تھپیڑوں کے
ساتھ لڑنا چاہتا تھا لیکن کنارہ ہی اسے ڈبونے پر تلا ہوا تھا۔

وہ کئی بار اپنی بیوی سے کہتا سرلا ہمارا ملک کتنے بڑے بڑے ماہرینوں،
ڈاکٹروں، انجینیروں، دانشوروں سے بھرا پڑا ہے۔ لیکن انہیں روزی روٹی کے لیے یہاں اتنا
پٹنا ہے کہ وہ اس سے پیٹ بھر کر روٹی تک نہیں کھا سکتے۔ اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم نہیں دلا سکتے،
اپنی زندگی میں وہ پوری آسائش نہیں دیکھ سکتے جن کے وہ متلاشی ہوتے ہیں۔ وہ نئے تجربے نہیں کر سکتے کیوں کہ
ان کے پاس ذرائع نہیں، لیبارٹریز نہیں، پیسہ نہیں، مدد نہیں۔ پھر جن کے واسطے وہ یہ سب کرنا چاہتے ہیں،
جن کے واسطے روشنیوں کے سیلاب لانا چاہتے ہیں۔ وہی ان کی زندگی میں روشنی کی کرن لانے
کی بجائے ان کی زندگیوں میں اندھیرے بکھیرنے کی کوشش کرتے ہیں، وہ لوگ اس ملک کو خوشحال بنانا چاہتے ہیں، لیکن ہائے!
وہ جون کے اندھیر قسم کو ساتھ چھوڑنا گوارا نہیں، صبح سے لے کر شام تک ماتھے لئے تن من سے کام کرو اور شام تھکے ماندے اپنی
زندگی کے چکروں میں پھنس جاؤ کوئی تفریح نہیں، کوئی رنگ نہیں، خوشبو نہیں، کتنی پھیکی
پھیکی سی ہے۔ یہ زندگی آخر اس میں کون آ کر رنگ بھرے خوشبو بھرے سب اپنی اپنی روشنی
کے لئے دوڑ دھوپ کر رہے ہیں۔ وہ سوچتا تھا۔

اس نے بھی بہت دوڑ دھوپ کی تھی۔ لیکن نتیجہ کیا نکلا وہی ڈھاک کے
تین پات۔ آخر یہ گھٹن، یہ بھوک، یہ مفلسی، یہ تنگدستی، یہ بے اعتنائی، یہ غربت کب ختم ہوگی
وہ روز سوچتا تھا۔ اپنے بچوں کے بارے میں اپنی بیوی کے بارے میں

لیکن اُس کی سوچ کی گردن پیسے کا پھندا جکڑ لیتا۔ اُس کی خواہشوں پر مایوسیوں کا پھندا پڑ جاتا۔

ابھی چھ ماہ گزرے تھے امریکہ سے آفر آئی تھی کہ وہ یہاں چلا آئے۔ ہم اُسے منہ مانگی تنخواہ دیں گے۔ لیکن اُس کے اپنے ملک میں اُس کی یہ حالت تھی کہ وہ منہ مانگی تنخواہ تو درکنار منہ مانگی زندگی بھی نہیں پا سکتا تھا۔

اُس کی زندگی میں بھی بہار کا پرتو جگمگا سکتا تھا۔ ایسا نہیں کہ اُس نے کوشش نہیں کی۔ اُس نے بدیس جانے کے لئے اپنے محکمہ میں اجازت نامے کی کئی درخواستیں گزاریں لیکن جو یہ کہہ کر رد کر دی گئیں کہ وہ اپنا دیس چھوڑ کر باہر نہیں جا سکتا۔ اُس نے سر لاکھ کہنے پر ابھی پچھلے ماہ ہی ایک بار پھر رجوع کیا۔ دو چار سفارشیں بھی کروائیں لیکن اب کے اسے یہ کہہ کر خاموش کر دیا گیا کہ پہلے وہ محکمے کا وہ بونڈ جو اس نے تعلیم حاصل کرتے وقت لیا ہے، واپس کر دے۔ تبھی اُس کو محکمہ کہیں جانے کی اجازت دے سکتا ہے۔

اُس نے کہا کہ وہ باہر جا کر اپنے تمام قرضے کی رقم لوٹا دے گا۔ پائی پائی چکا دے گا۔ لیکن اُس کی کسی نے ایک نہیں سنی۔

کمال کی تہذیب ہے، بھی نہ ترقی نہیں کرنے دیتی، کسی کو آگے نہیں بڑھنے دیتی، جینے نہیں دیتی۔ بدیس وہ اس لئے نہیں جا سکتا کہ وہ مفلس ہے، قلاش ہے۔ اُس کے پاس باقی لوگوں کی طرح وسیلے نہیں، چالاکیاں نہیں، حربے نہیں۔ وہ ایک حساس انسان ہے۔ جانے نہ جانے کتنے ہی لوگ ان چند روپوں کو لات مار کر بغیر قرض چکائے بدیسوں میں جا بسے ہیں لیکن وہ اس لئے نہیں جا سکتا۔ کیوں کہ وہ شریف ہے، اس کے پاس بینک بیلنس نہیں، خوبصورت بیوی نہیں۔ وہ مفلس ہے، قلاش ہے۔ آخر یہ کیسی زندگی ہے؟ وہ کیوں نہیں بدیس جا سکتا؟ وہ سوچتا تھا اور کڑھتا تھا۔ یہ ڈھائی تین سو روپلے کب تک زندگی پر پیوند کی طرح چپکے رہیں گے۔ ان سے تو تن بھی نہیں ڈھانپا جا سکتا۔ پچھلے کئی برسوں سے وہ لگاتار کوشش کر رہا تھا کہ کسی طرح اس کو اُس کے شاندار مستقبل کے لئے ایک بار یہاں سے چھٹکارا حاصل ہو جائے۔ لیکن جہنم کے یہ کیڑے کب چھوڑتے ہیں جو مفلسی نے بھوک کے تالاب میں پھیلا رکھے ہیں۔

وہ اپنے بیوی بچوں کا علاج بھی تو نہیں کرا سکتا تھا۔ آخر وہ کیا کرے۔
اگر یہ بیچارے بدیسوں کے خواب نہ دیکھیں تو اور کیا کریں آخر یہاں ملتا ہی کیا ہے۔

اور پھر ایک دن اُس نے فیصلہ کر ہی لیا کہ اب وہ بہت زیادہ دن اپنے بچوں کو سسکتے اور بیوی کو چارپائی پر بن دوائی کے ایڑیاں رگڑتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا — پھر آج وہ اپنے آپ سے ہی گزر گیا۔

لاش میرے سامنے پڑی ہے اس کی بیوی کی آنکھیں چھت میں پنکھے کے ساتھ لٹکے پھندے پر جامد ہو کر رہ گئی ہیں۔ اُس کے بچے ہراساں سے چپ چاپ کھڑے ہیں۔ کوئی رو بھی تو نہیں رہا، عجیب سا سکتہ طاری ہے۔ میں سوچتا ہوں اس نے خودکشی کر کے اچھا تو نہیں کیا۔ اُس نے اپنی زندگی ختم کر کے اصل میں اپنے ان چھوٹے چھوٹے بچوں کی زندگی ختم کر لی ہے۔ لیکن یہ اُس کا قصور نہیں۔ کہاں ہیں وہ لوگ جو اس بات کے ذمہ دار ہیں۔ شاید وہ چپ چاپ بارونق سڑکوں پر گزر رہے ہیں۔ کیا ہوا جو ملک ایک اچھے ڈاکٹر کو کھو بیٹھا ہے ہم اور ڈاکٹر پیدا کریں گے یہاں ڈاکٹر تو پردوں کی طرح اُگتے ہیں —

کتنا بے رحم آدمی تھا مرنے والا بھی۔

آخر میں سوچتا ہوں اس کی کیا کہانی لکھوں اس کی کہانی میں تو کوئی درد نہیں کوئی رنگ، ہنر، کوئی اثر نہیں۔ یہ پھیکی پھیکی سی کہانی ہے جو اجاڑ جنگلوں میں صرف بن پتوں کے پیڑوں کی طرح کھڑی جھولتی رہتی ہے۔